سپنوں کے دام

ڈاکٹر برج پریمی کا خاندانی نام برج کشن ایمہ ہے۔ وہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو سری نگر (کشمیر) کے ایک اہلِ علم کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت شام لال ایمہ اپنے عہد کے ایک معروف قلم کار تھے اور اُردو اور فارسی ادبیات کے عالم تھے۔ برج پریمی کے ذوقِ ادب کو سنوارنے میں اُن کا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ ۱۴ سال کی عمر میں برج پریمی والد کے سایۂ شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ والد کے بے وقت انتقال کے بعد پریم ناتھ پردیسی (مرحوم) نے ذوقِ ادب کی تہذیب کی۔

ڈاکٹر برج پریمی بنیادی طور پر کہانی کار تھے۔ انھوں نے پہلی کہانی ۱۹۴۹ء میں "آقا" کے عنوان سے لکھی۔ برسوں تک کئی ادبی تنظیموں اور ادارں کے ساتھ وابستہ رہے۔ ۱۹۶۱ء میں ایم۔اے (اُردو) درجہ اوّل میں امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ ۱۹۷۶ء میں "سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر انھیں کشمیر یونی ورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ برِ صغیر کے نامور ناقدینِ گرامی کے مطابق یہ مقالہ اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی اُردو کے معروف نقّاد اور محقق تھے۔ ادبیات کے موضوع پر ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ادب کے علاوہ کشمیریات سے بھی ان کی گہری دلچسپی تھی۔ اُردو کے توسط سے انھوں نے کشمیری تاریخ، ثقافت اور ادب کے بیش بہا پہلوؤں کو اُردو قارئین تک پہنچانے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے قابلِ قدر علمی اور ادبی کارناموں کے پیشِ نظر جموں و کشمیر کلچرل اکادمی، یوپی اُردو اکادمی، مغربی بنگال اُردو اکادمی اور آل انڈیا ہندی اُردو سنگم نے انھیں اعزازات سے نوازا تھا۔

۱۹۹۰ء کے المناک حالات میں جب وہ ترکِ وطن کر کے جموں آئے تو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

پروفیسر ہدشن لال کول صاحب

کے لیے

احترام

کے ساتھ

برائے اظہار خیال

ڈاکٹر یحییٰ ریوطانی

۸ اپریل ۲۰۰۶

فون

9419192978
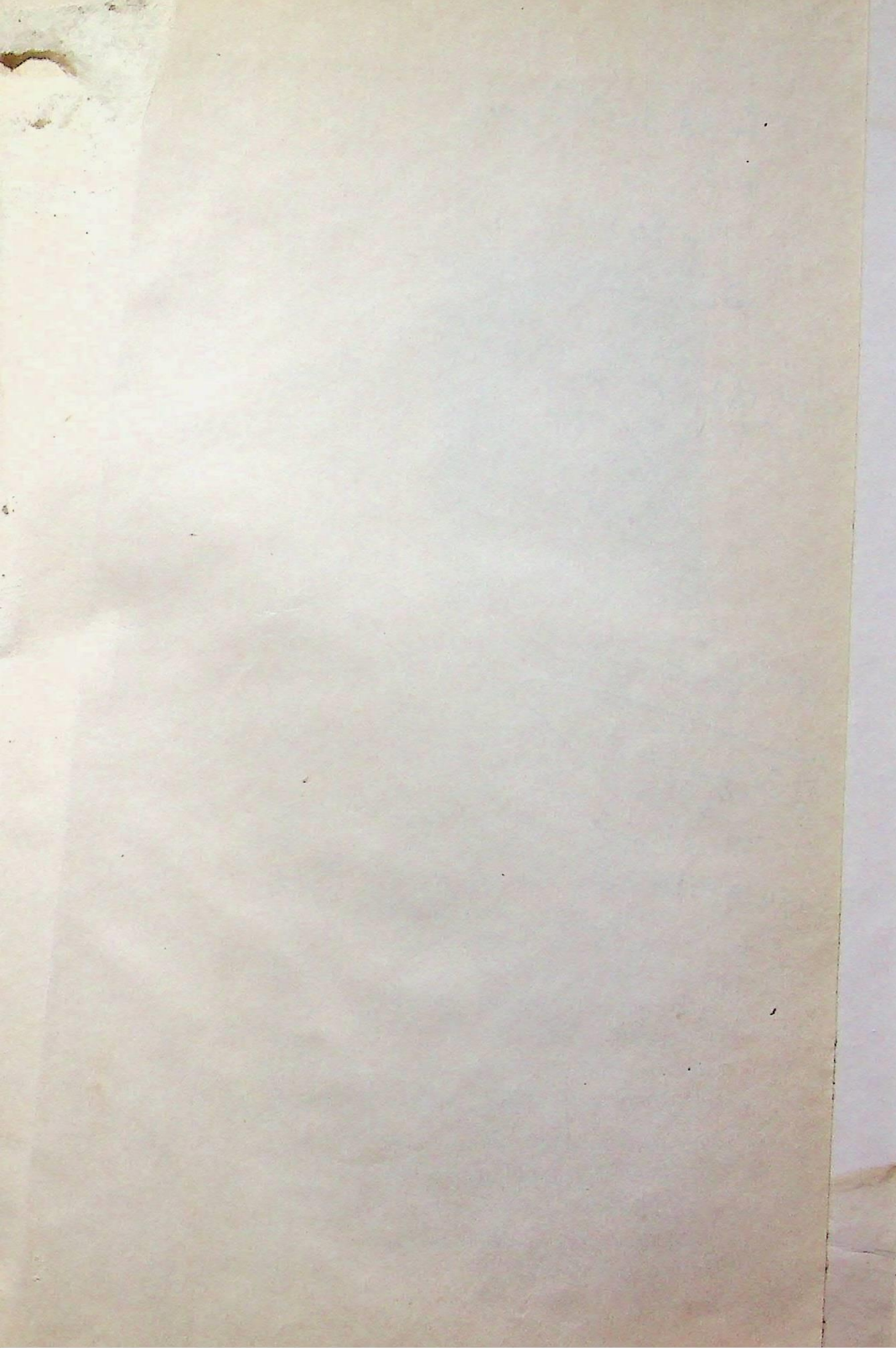
سپنوں کی شام

ڈاکٹر برج پریمی

زیرِ اہتمام:

برج پریمی میموریل کمیٹی

جموں (توی)

SAPNOO KI SHAM

collection of short stories

BY DR. BRIJ PREMI

PRICE RS. 100/-

سپنوں کی شام

(افسانے)

ڈاکٹر برج پریمی

دیپ پبلی کیشنز

۳/۱ نصیب نگر - پمپوش کالونی - جانی پورہ

جموں - ۱۸۰۰۰۷ (توی)

۳/۱ نصیب نگر۔ پمپوش کالونی۔ جانی پورہ جموں)

۱۹۹۵ء

رچنا ایمہ نے
فوٹو لیتھو ورکس دہلی سے
چھپواکر
دیپ پبلی کیشنز جموں
سے شایع کی

ترتیب
پریمی رومانی

قیمت:۔ سو روپے (۱۰۰)

تقسیم کار:۔

- سیمانت پرکاشن:۔ ۹۲۲ کوچہ چیلان، II فلور دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- پاک بک چینل:۔ پکہ ڈنگا، جموں (توی)
- دیپ پبلی کیشنز:۔ ۳/۱ نصیب نگر۔ پمپوش کالونی جانی پورہ، جموں ۱۸۰۰۰۷

فہرست

خود کلامی کا جادوگر

مجھے خوشی ہے کہ پریمی رومانی اپنے والدِ محترم مرحوم برج پریمی کی کہانیوں کا مجموعہ "سپنوں کی شام" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کے لیے کہا ہے۔ اگر وہ نہ کہتا میں جب بھی اپنے عزیز دوست کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا۔ پچھلے برس میں نے اس پر ایک خاکہ لکھا تھا " درد کا امانت دار : برج پریمی" مجھے آج بھی اس سے کئی ملاقاتیں یاد آرہی ہیں، جس میں اس کی محبت اور خلوص کے چشمے بہتے تھے۔ وہ میرا دوست بھی تھا اور رفیق بھی۔ اس نے ایک بار مجھ سے ایک فرمائش کی تھی کہ میں کشمیر کے موضوع پر لکھی ہوئی تمام کہانیاں اسے دے دوں تاکہ وہ اسے کتاب کی شکل میں چھاپ سکے۔

میں آج تک اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور برج پریمی کو اپنی کہانیاں نہیں بھیج سکا۔ اس کا قلق مجھے ساری زندگی رہے گا۔

برج پریمی کے خاکے کو میں نے ان الفاظ پر ختم کیا تھا:

"برج پریمی تم بہت سچے اور کھرے آدمی
تھے۔ تم اس دُنیا کے قابل نہیں تھے، جس میں
میرے جیسے جھُوٹے دوست رہتے ہیں جو صرف
دعوے کرتے ہیں اور جنھیں وعدوں کی عظمت
کا احساس نہیں۔"

"میں اپنے بھرپور جھوٹے پن سے تمھاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔"
پریمی رومانی کی بھیجی ہوئی کہانیاں میں نے پڑھیں۔ لگتا ہے کہ
برج پریمی نے ایک خاص عرصے تک ہی کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد اس نے
اپنے آپ کو تحقیقی کام میں لگا دیا۔ جو کہانیاں میرے سامنے ہیں اُن میں
آخری کہانی "لمحوں کی راکھ" اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ماہنامہ "فلمی ستارے"
دہلی میں چھپی تھی۔ باقی سب کہانیاں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۸ء کے دوران
لکھی گئی ہیں جن میں سوائے دو ایک کے سب ہی شائع شدہ ہیں۔ ایک بات
جو ان سبھی کہانیوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ برج پریمی کا کہانی لکھنے کا
انداز خود کلامی کا انداز ہے یعنی سلی لوکی (SOLILOQUY) کا انداز اس
کا ہر کردار خود کلامی کر رہا ہے اور جب وہ کسی دوسرے شخص کے بارے
میں بولتا ہے یا اپنے سماج اور ماحول کا ذکر کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ اپنے
آپ ہی سے گفتگو کر رہا ہے۔ خود کلامی کا یہ عمل بڑا ہی پُر عذاب ہوتا ہے۔ کیونکہ بات
کرنے والا جب بات کرتا ہے تو اپنی رُوح میں لگے ہوئے پُرانے اور نئے زخموں
کو چھیڑتا ہے اور جس کسک کا احساس اُسے خود ہوتا ہے وہی کسک دھیرے
دھیرے پڑھنے والوں تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ میں اُسے لکھنے والے کی ایک
بڑی اچیومینٹ (ACHEIVMENT) سمجھتا ہوں لیکن اس سے
کہانی کمزور ہو جانے کا بھی امکان رہتا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ برج
پریمی کی کچھ کہانیاں جو اس نے ۷۸ء کے بعد لکھی تھی، دستیاب ہو جائیں تو
اس کے کرافٹ میں شیب کے بارے میں تفصیل سے بات کی جا سکتی
ہے۔ کیونکہ میرے سامنے اس کی یہ پرانی کہانیاں ہی ہیں۔ اس لیے

میں برج پریمی کے فن کا پوری طرح جائزہ نہیں لے سکتا۔

ان سب کہانیوں میں دو باتیں بڑی کھل کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ برج پریمی کو اپنی وادی سے جتنا پیار ہے اور اپنے ہم وطنوں کے لیے جتنا درد اس کے دل میں ہے اس کی عکاسی ان کہانیوں میں پوری طرح ہوتی ہے۔ جس زمانے میں یہ کہانیاں لکھی گئی ہیں، اس دور کے کشمیر اور اب کے کشمیر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برج پریمی اگر اب زندہ ہوتا تو اس کے قلم سے پھول نہ جھڑتے بلکہ آنسو ٹپکتے۔ اس وقت وہ اگر حیات ہوتا تو کشمیر کی ادبی تاریخ کو اس سے بہتر لکھنے والا اور کوئی ادیب ہمیں نہ ملتا۔ دوسری بات جو ان کہانیوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے وہ ہے اس کی LEFTIST LEANINGS اُس نے مارکس اور لینین کا ذکر بھی اپنی کہانی میں کیا ہے اور ترقی پسندی کی ان علامتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اُسے عزیز تھیں۔ برج پریمی بنیادی طور پر ترقی پسند ادیب تھا اور افسانوی ادب کو اس کی بہت بڑی دین یہی ہے کہ اُس نے کشمیر کی وادی کو ایک ذہین، درد مند اور انسان دوست ادیب کی نظر سے دیکھا۔ اور اُس کی نگاہیں ان مسائل پر جمی رہیں جو ایک عام آدمی کے مسائل تھے۔ وہ مسائل آج بھی اُسی طرح سے اپنا حل تلاش کرانے کے لیے ترس رہے ہیں۔ شاید ان کا حل موجودہ نسل پیش نہیں کر سکے گی۔ ایک اچھے مستقبل کا انحصار اگلی نسل پر ہے اور ہماری اُمیدیں اسی سے وابستہ ہیں جس کا ایک نمائندہ اُن کا بیٹیا پریمی رومانی ہے۔

میری دعا ہے کہ برج پریمی کی یہ کہانیاں جلد چھپیں اور پڑھنے والوں تک پہنچیں اور پریمی رومانی جس خلوص دلی سے اپنا فرض پورا کر رہا ہے اس میں وہ سُرخ رُو ہو۔ میں ایک بار پھر انھیں سطروں کو دہراتا ہوں جو میں نے برج پریمی کے خاکے کے اختتام میں لکھی تھیں:

"برج پریمی تم بہت سچے اور کھرے
آدمی تھے۔ تم اس دُنیا کے قابل نہیں تھے
جس میں میرے جیسے جھوٹے دوست
رہتے ہیں جو صرف وعدے کرتے ہیں
اور جنھیں وعدوں کی عظمت کا احساس
نہیں۔"

"میں اپنے بھر اور جھوٹے پن سے تمھاری عظمت کو سلام
کرتا ہوں۔"

۲۸ اپریل ۱۹۹۵ء

کشمیری لال ذاکر
سکریٹری
ہریانہ اردو اکادمی
ہریانہ

میری بات

لگ بھگ بیس برس قبل کی بات ہے

میں نے والدِ محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی صاحب کی کہانیوں کو ترتیب دے کر شائع کرنے کی کوشش کی تھی اور بڑی عرق ریزی سے اُن کی کہانیوں کو تلاش کیا تھا۔ یہ کہانیاں پرانے رسائل و اخبارات میں شائع ہو کر بکھری ہوئی شکل میں تھیں لیکن میری اس اَن تھک محنت پر اُس وقت پانی پھر گیا جب یہ پورا مسودہ ایک علمی و ادبی ادارے نے غیر ذمہ دارانہ حرکت کا ثبوت دے کر گم کر دیا، جسے میں نے یہ مسودہ اشاعت کی غرض سے ارسال کیا تھا۔ اس دوران میں کسی اور کام میں اُلجھ گیا اور میرے ذہن سے یہ کہانیاں شائع کرنے کا خیال نکل گیا۔ والدِ مرحوم بھی تنقید و تحقیق کی طرف رجوع ہوئے اور افسانہ لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ لیکن چونکہ افسانہ اُن کا پہلا عشق تھا۔ اِسلئے کبھی کبھی افسانہ ضرور ہو جاتا۔ اُن

کے کئی تنقیدی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں لیکن اُن کی کہانیوں کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔

آج جب کہ میں اُن کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کر رہا ہوں اُن کے کاغذات میں سے نئے سرے سے کہانیاں تلاش کرنے لگا ہوں تو بہت ساری کہانیوں کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ تلاشِ بسیار کے بعد جو کہانیاں ہاتھ لگ گئیں، قارئین کی نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر وہ بقیدِ حیات ہوتے تو ضرور کہانیوں کا انتخاب کرتے اور پھر ان کو شائع کرتے لیکن میں یہ کہانیاں شائع کرتے وقت کسی قسم کا انتخاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ جو کہانی بھی میرے سامنے آئی۔ کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ میری ترتیب اور میری پسند ناقص بھی ہوسکتی ہے۔ جس کے لئے میں قارئین سے معذرت چاہتا ہوں۔

والد صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ اُن کا پہلا افسانہ "آقا" کے نام سے ۱۹۴۹ء میں روزنامہ "امر جیوتی" سرینگر میں شائع ہوا۔ شروع میں اُن کے والد پنڈت شام لال ایمہ (مرحوم) نے اُن کے ذوقِ ادب کی تہذیب کی۔ اُن کے انتقال کے بعد انہوں نے مشہور افسانہ نگار جناب پریم ناتھ پردیسی (مرحوم) کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور انہوں نے اپنے مطالعہ کو ہی اپنا رہنما بنایا۔ "آقا" کے بعد والد مرحوم نے بیسیوں افسانے خاکے اور ادب پارے لکھے۔ یہ افسانے اور خاکے ملک کے معتبر رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ بیشتر کہانیاں مرحوم انجمن اربابِ ذوق

اور حلقہ علم و ادب سری نگر کی مختلف نشستوں میں پڑھ چکے ہیں اور داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ نشستیں ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے آس پاس سری نگر کے اندرونی علاقوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اِن دونوں انجمنوں نے اُس دور میں علم و ادب کی ترقی و بقا کے لیے کافی کام کیا۔ اس کی مختلف نشستوں میں ریاست اور بیرون ریاست کئی مستند قلم کار حصہ لیا کرتے تھے۔

بہر حال مجھے بے حد مسرت ہے کہ میں اُن کی کہانیوں کا مجموعہ "سپنوں کی شام" شائع کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ میری یہ کاوش آپ کو پسند آئے گی اور آپ اِن کہانیوں کو توجہ سے پڑھیں گے اور اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔ جس کے لیے میں منتظر رہوں گا۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۵ء

برجی رومانی
"تپسیا" ۲۳ نصیب نگر۔ پمپوش کالونی
جانی پورہ جموں۔ (توی)

خوابوں کے دریچے

دسمبر کی ایسی ہی کالی اور بھیانک رات میری یادوں کے افق پر اُبھر آتی ہے
روح کو منجمد کرنے والی سائیں سائیں کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں اب بھی میرے
روم روم کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ اور جیوتی کا جوالا مکھی کی طرح تپتا ہوا چہرہ میری
نگاہوں کے سامنے جم جاتا ہے۔ اور میرے من میں اتھل پتھل مچ جاتی ہے۔
دس سال پہلے جیوتی نے جب اس گھر کے آنگن میں قدم رکھا تھا۔ تو الہڑ گیتوں
کے درمیان پرتھوی کی ماں نے اس کی آرتی اُتاری تھی۔ وہ لوگ کے رنگوں بھرے
منڈل کی ریکھاؤں پر اُس کی حسین آنکھوں میں اپنی مرحوم بیٹی شیلا کا عکس
دیکھ لیا تھا۔ وہی رنگ روپ وہی گہری سیاہ آنکھیں، وہی حیا کا نُور ——
بوڑھی ساس کے گھاؤ کھل گئے تھے۔ لیکن پھر پلکوں کی ہلکی نمی کو اُس نے
ممتا کی خوشبو میں مِلا کر اپنے زخموں کی ٹیسوں پر مرہم کر دیا تھا۔ اور اُسی
قیامت کی رات کو پرتھوی —— جیوتی کی جیوت، اس کے مہندی رچے

منڈلی ہاتھ، اُس کا دمکتا ہوا چہرہ، اُس کی جوانی کی مدھ شالہ دیکھ کر دیوانہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

پرتھوی کی دیوانگی کا ردعمل جیوتی پر کیا ہوا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پرتھوی کی بے قرار باہنوں نے جیوتی کے کسما تے ہوئے بدن کے تار چھیڑ دیئے تھے۔ اُس کا انگ انگ حیا کے خول سے باہر آتا گیا۔ اُس کی خود سپردگی کا عالم پرتھوی کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ اور وہ سمجھ بیٹھا کہ زندگی پوسٹل کلرکی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن یہ تجربہ جلد ہی ایک حماقت ثابت ہوا۔ جیوتی اس کی رفیقۂ حیات، لکھے پڑھے گھرانے کی اکلوتی اولاد تھی۔ اُس کا دادا اپنے زمانے کا مشہور شاعر واقع ہوا تھا۔ دادا کی آغوش میں جیوتی کا اپنا شعور نکھرا تھا۔ اور وہ بھگتی کے رس میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگی تھی۔ لیکن اس شاعری کا رُخ اس وقت دھیمے دھیمے بدل گیا جب پرکاش نام کے ایک کوی نے اس کے من کو موہ لیا۔ پرکاش کی شاعری زمانے کی آوازِ بازگشت تھی۔ اس میں ایک بے نام سی کسک، ایک عجیب بے قراری ملتی تھی۔ جیوتی غیر محسوس طریقے سے اس آواز کی طرف بہتی گئی۔ پرکاش نے جیوتی کو متاثر کیا۔ اور جیوتی نے پرکاش کو۔ اخباروں اور رسالوں میں دونوں کی چھپنے والی تخلیقات نے دھیرے دھیرے ایک گھمبیر صورت اختیار کرلی۔ پرکاش کی شاعری کا جلال اور جیوتی کی نظموں کا جمال ایک نئی منزل کی نشاندہی کرنے لگا۔ جلال اور جمال کی ان پرچھائیوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ عہد و پیمان ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا۔ جب دھڑکتے ہوئے دل لے کر دو جوانیاں ملتی ہیں۔ لیکن ہونی نے اَن ہونی کردی۔ پیار و محبت کے یہ راز سینوں سے نکل کر دوسروں تک پہنچے۔ بزرگوں نے دانتوں تلے

انگلیاں دبادیں۔ جیوتی کے خاندان نے جیونی کے پیار کو خاندان کی مریادا پر قربان چڑھا دیا۔ جیوتی کے جذبات پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ پرکاش نے جیوتی کو حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مگر تقدیر کی اندھی لکیر نے خوابوں کے دریچے بند کر دیئے۔ پرکاش جیوتی کا ہاتھ پا کر کٹی پتنگ کی طرح ڈھولنے لگا۔ اس سارے ناٹک میں جیوتی ایک خاموش تماشائی بن کر رہ گئی۔ بے حس!

اس کی کویتا میں چھپی ہوئی اس کی آواز لوٹ گئی۔ اس سے کچھ بھی نہ ہو سکا نہ فریاد نہ بغاوت اور نہ ہی اپنی بات منوانے کے لیے کوئی ستیہ گرہ۔ حتیٰ کہ ایک رات لگن منڈپ پر پوتر اگنی کے سامنے وہ پرتھوی کی جائیداد بن گئی

پرکاش کے ساتھ اُس کے تعلقات کیا تھے اور کیا نہیں تھے —— یہ سب قصۂ پارینہ بن گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں کاجل کی سُرمئی لکیروں کو کاٹتی ہوئی آنسوؤں کی لکیر تھی۔ یہ پراشچت کے آنسو تھے یا محبوب سے ہمیشہ کی جُدائی کے آنسو —— کون جانے؟

پرتھوی نے ایک دیوار بن کر دو جذبوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا!

پرتھوی ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ اُسے نہ شاعری سے دلچسپی تھی اور نہ کلا کی نزاکتوں کا احساس لیکن اُس کے یہ معنی نہیں کہ عورت کے تصور سے اُس کے من میں کھلبلی پیدا نہ ہوتی ہو۔ شاعری سے پہلے اُس نے بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح بہت سے خواب بُن لئے تھے۔ بے سرو پا خواب! جیوتی کے جغرافیہ سے نا آشنا وہ کشمیر سے باہر ملازمت کے سلسلے میں رہائش پذیر تھا۔ اور اپنے خوابوں کی حقیقت پانے کے لئے صرف چند ایام کے لئے گھر چلا آیا تھا۔ یہاں جیونی کے جسم کی لذت پا کر اُس کے جذبات

آسودہ ہو چکے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوتے ہی جیوتی کو ماں کی تحویل میں چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ اُس کا دل بھاری تھا۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے، مرادوں کی رات کا خمار تھا۔

وقت کی ناؤ آہستہ آہستہ بہتی گئی۔ پرتھوی اضطراب اور بے قراری کو گلے سے لگائے سسک رہا تھا۔ بعض اوقات اُسے تنہائی کا شدید احساس ہوتا۔ اور وہ بے بس ہو کر ہانپنے لگتا ۔۔۔ لیکن تب جیوتی کے پیار میں ڈوبے ہوئے معطر خطوط اُس کو حوصلہ بخش دیتے۔ اُسے لگتا جیسے جیوتی ابھی ابھی اُس کی باہنوں کے حلقے سے نکل کر اُس کے لئے چائے بنانے گئی ہو۔ اور ایک بار پھر اُس کا سارا جسم ایک عجیب حدت سے تپ جاتا اور

اور ــــــــ

لیکن پھر جیوتی کے خطوط سے پیار کی خوشبو کم ہونے لگی۔ پھر خطوط بھی کم ہونے لگے ـــ اور پھر جیوتی کی سوہنی تصویر بھی بے رنگ ہونے لگی۔ ایک طوفان اُٹھ آیا ــــــــ پرتھوی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ پرتھوی کے طویل خطوط پیار کی خوشبو اور بوسوں کی مٹھاس اور اندیشوں کے سایے لیئے چلے آتے۔ مگر نہ کسی نے خوشبو محسوس کی نہ مٹھاس کو چکھا اور نہ ہی سایوں کو کسی نے ایک نظر دیکھا۔ پرتھوی کٹ کے رہ گیا۔ یہ سب اچانک کیا ہو گیا تھا؟ پرتھوی کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ وہ خود حالات کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔ لیکن جنگ شروع ہو چکی تھی۔ تمام قسم کی چھٹیاں منسوخ ہو چکی تھیں۔ اور پرتھوی اور جیوتی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

جیوتی ـــــ جیوتی کا اندر پھر زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اندر جس پر اُس نے خاندان کی مریادا کی خاطر باہر کا غازہ تھوپ دیا تھا۔ اور رواعتی قدروں

کا غلاف اوڑھ لیا تھا۔ اپنے اندر کی آواز اور خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اور باہر کا جسم اپنی تمام جنسی کشش کے سمیت پرتھوی کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی اندر ایک بار پھر بیدار ہو چکا تھا۔ چند ماہ پہلے اُسے ایک اذیت ناک خط ملا تھا۔ کسی سہیلی کی معرفت پرکاش کا خط! پرکاش نے جیوتی کی شادی کے بعد خود بھی ڈیرہ ڈون جا کر شادی رچالی تھی۔ ایک چھوٹا سا گھر بسا لیا تھا۔ اُسے ایک اچھی ملازمت ملی تھی۔ جیوتی اب اُس کے لئے محض ایک چھلاوہ تھی ـــــ ایک جھوٹ! لیکن تقدیر کے اندھے ہاتھوں نے اُسے ایک اور ڈگر پر پھینک دیا۔ ایک رات کسی دوست کے گھر سے اپنی بیوی سمیت واپس آ رہا تھا کہ اُس کا سکوٹر ایک گاڑی کی زد میں آگیا۔ اس حادثے میں بیوی شدید زخمی ہوئی۔ اور آخر ہسپتال میں جاں بحق ہو گئی۔ خود پرکاش کی ایک ٹانگ ناکارہ ہو گئی۔ چند ماہ ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹ آیا ـــــ جہاں جیوتی رہتی تھی ـــ چھلاوہ! لیکن جب جیوتی کو یہ دل دوز خبر ملی تو دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی ـــ پرکاش کی حالت اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس کا پرائشچت انارتمار ہوا۔ اور ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب حالات اعتدال پر آئے تو پرتھوی کو دفتری مصروفیات سے نجات ملی۔ لیکن اس وقت تک دو سال اور بیت چکے تھے۔ سہاگ رات کے عطر بیز لمحات کو وقت کی دھول نے برہم کر دیا تھا۔ لیکن پرتھوی ـــ جنم جنم کا پیاسا ـــ اُس کے وجود میں وہی بے قراری وہی بے پناہ پیار، وہی پیاسی نگاہیں تھیں۔ اور جیوتی۔ اُس کی محبت کے سرچشمے سوکھ گئے تھے۔ وہ چھلکاتی ہوئی مدھو بالا خالی مینا لئے کھڑی تھی، بے حس گونگی، زندہ لاش! پرتھوی اپنے سینے میں طوفان لے آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ان گنت سپنے تھے۔ اس نے جب جیوتی کو اپنے سینے کے ساتھ لگا دیا تو اُسے احساس

ہوا کہ جیوتی زندہ لاش ہے۔ ٹھنڈا گوشت! اُس کے سپنے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ جیوتی کے پاس اب نہ مسکان تھی نہ گالوں کے امبری سیب اور نہ برہ کی طرح سیاہ کاجل بھری آنکھیں۔ وہاں دِل کو اکھرنے والی اماوس کی سنسان راتوں کا سناٹا تھا۔ پرتھوی کے کانوں نے مشکوک آوازیں سُنیں۔ اُس کی ناک نے سڑی ہوئی مچھلی کو سونگھ لیا۔ اور اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ جیوتی کسی اور کی ہے۔ شکوک نے ضرب اور تقسیم کے فارمولے سے رشتوں کی نزاکتوں کو بھانپ لیا۔ جیوتی نے پرکاش کو بھائی کی حیثیت سے متعارف کرالیا تھا۔

رشتے کا بھائی اب بیساکھی کے سہارے کبھی کبھی جیوتی کے ہاں چلا آتا پرتھوی نے جیوتی کے بے رنگ خطوط کے ڈانڈے پرکاش کی بیساکھی کے ساتھ مِلا دیئے ——— خالی جگہیں خود بخود پُر ہو گئیں۔

پرتھوی کا سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا!

پرتھوی شاعر تھا افسانہ نگار۔ لیکن جیوتی اُس کے لئے ایک آئیڈیل تھی۔ اپنے آئیڈیل کو مٹتے دیکھ کر اُس کے تصورات کا شیش محل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اُس نے پوسٹل کلرکی سے مستعفی ہو کر یہیں پر دوسری ملازمت اختیار کرلی۔ اور پھر برسوں پہلے چکھی ہوئی شراب میں پناہ لی۔ "بے پناہ شراب" "ایک گونہ بے خودی" کی تلاش! ماں نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ جیوتی سے اُسے نفرت ہو گئی اور وہ سارے تعلق ت جو ایک بیوی اور شوہر میں ہوا کرتے ہیں منقطع ہو گئے۔ جیوتی اس بھری دنیا میں بے بس ہو کے رہ گئی۔ پرکاش حالات کے تھپیڑوں کی مار کھا کر اپنے بھائی کے پاس کلکتے چلا گیا۔ جیوتی کو ہوش آیا تو جہلم میں کافی پانی بہہ چلا تھا اُس کے پاس اب بھاگیہ کی ٹیڑھی ریکھائیں تھیں، غیر متوازی ریکھائیں جو ہمیشہ کسی نقطے پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ اُس نے ایک دیو داسی کی طرح پرتھوی کی پوجا کر کے اُس کے من کو موہ

لینا چاہا۔ لیکن پرتھوی پتھر کی مورتی میں ڈھل چکا تھا۔ بے نیاز، کٹھور اور بے جان۔
وقت سسکیاں لیتا ہوا آہستہ خرامی سے بہتا گیا۔ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں!
جیوتی اور پرتھوی کی زندگی کسی سمجھوتے کے بغیر گذرتی گئی۔ ایک ہی گھر میں رہتے
ہوئے دونوں میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس بیچ پرتھوی کئی بار سخت بیمار ہوا۔ جیوتی
نے پرتھوی کی صحت یابی کے لیئے کیا کچھ نہ کیا۔ دن اور رات ایک کر دیئے۔ اور اپنے
زیور بیچ کر اس کا علاج کروایا۔ پرتھوی کی صحت سنبھلی۔ مگر اُس کے دل میں اٹکی ہوئی
پھانس نہ نکل سکی۔ روز روز کے جھگڑوں کی ستائی ہوئی بوڑھی ماں حسرتوں کے
مزار سینے میں چھپائے پرلوک سدھاری اپنی زندگی میں دادی نہ بن کر اس نے
عافیت اسی میں جان لی کر رام نام جپتے ہوئے آنکھیں موندلی جائیں! اُسے دکھ
تھا۔ کہ پرتھوی نے نہ صرف یہ کہ جیوتی پر ظلم کیا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو بھی قتل
کیئے جا رہا ہے۔ لیکن پرتھوی رندِ بلانوش بن چکا تھا۔ ماں کی موت سے
اُس کا ذہنی توازن اور بھی بگڑ گیا۔ اُس نے بے تحاشہ پینا شروع کر دیا
شام ڈھلتے ہی پرتھوی کے کمرے کی کھڑکی کھل جاتی اور ساغر و مینا کا دور شروع
ہو جاتا۔ پرتھوی کبھی کبھی جلتی ہوئی آنکھوں سے جیوتی کی طرف دیکھتا۔ اُس
کی آنکھوں میں شیطانی قہقہے تھرک اُٹھتے۔ وہ باہیں پھیلائے جیوتی کی طرف
بڑھتا۔ جیوتی بال بکھرائے اُس کا سواگت کرتی۔ وہ جیوتی کی طرف جام بڑھا
دیتا۔ اور جب جیوتی انکار کرتی تو وہ اُس کی بوٹی بوٹی کاٹ لیتا۔ مار مار کر
اُس کے بے رنگ چہرے کو لال کر دیتا۔ بالوں سے گھسیٹ کر لہو لہان کرتا۔
قہقہے مار کر چلاتا اور چلا کر رونے لگتا۔ یہ اُس کی دیوانگی تھی۔ انتقام کا
شدید جذبہ تھا، یا محض اُس کی سادیت پسندی تھی ___ کون جانے؟

[۲]

اور آخر ایک دِن جیوتی نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ اور پرتھوی کا ساتھ دینے لگی۔ یہ اُس کی تپسیا کی ایک نئی منزل تھی!

پرتھوی ایک بار پھر شکست کھا چکا تھا!

جیوتی اب ایک خزاں زدہ چنار تھی۔ جس کے پتے سرسراتے ہوئے گر چکے ہوں۔ اُس کی کتاب زِندگی کے پہلے حِصے پر موٹے حروف میں پرکاش لکھا ہوا تھا۔ پرکاش کی کٹی ہوئی ٹانگ اُس کی روح کا سب سے بڑا گھاؤ تھا۔

دوسرے حِصے کے آغاز میں پرتھوی لکھا ہوا تھا۔ جس کی تپسیا اُس نے دیوداسیوں کی طرح کی تھی۔ جس سے اُسے بے پناہ ہمدردی تھی اور جس کے لئے اُس نے زندگی میں کئی ویرانیاں مول لی تھیں۔

آخری حِصے پر جیوتی کا اپنا نام تھا ـــــ پرکاش کی جیوتی پرتھوی کی جیوتی! کوکھ جلی، بانجھ جیوتی ـــــ صرف جیوتی!

اور پھر ـــــ پرتھوی کا کمرہ مے کدہ بن گیا۔ پرتھوی کی "بے خودی" کے لئے شراب کے تقاضے بڑھنے لگے۔ گھر میں نحوست نے ڈیرہ جما لیا۔ مکان گروی میں چلا گیا ـــــ گھر کا سامان بِکنے لگا۔ پرتھوی نے شوقِ مے نوشی کو پورا کرنے کے لئے کون سی کسر باقی رکھ چھوڑی ـــــ عیاش، ہوس پرست، اور ریاکار اُس کے دوست بن گئے ـــــ پرتھوی نے جیوتی کو اُن کے سپرد کرنا چاہا۔ شراب کی ایک نشیلی شام کے لئے دیوداسی کو بلیدان چڑھانا چاہا اور اپنی آنکھوں کے سامنے جیوتی کی عصمت دری سے لذت لینا چاہی اور دسمبر کی اسی کالی اور بھیانک رات کو پرتھوی کے کمرے کی کھڑکیاں پھر اسی طرح کھُلی تھیں۔ اُس کے خوابوں کے دریچوں کی طرح ـــــ خوابوں کے یہ دریچے جیوتی کے من میں بھی کھُل کر بند ہو گئے تھے ـــــ لیکن آج وہ کسی کو بُلا رہی تھی!

کس کو ؟

پرکاش کو ـــــ تاکہ وہ کرشن بن کر دروپدی کی لاج بچالے، یا پھر کسی غیر مرئی طاقت کو؟ ـــــ یا پھر اپنے آتم بل کو ـــــ ؟ وہی سیاہ دراز بال، وہی انگڑائیاں لیتا ہوا کافر شباب، وہی مست آنکھوں کے جام ـــــ اور جب پرتھوی کے چند عیاش ساقی نشے میں دھت جیوتی کے جسم کو ہانپتے ہوئے نوچنے لگے تو ـــــ تو جیوتی کا جسم ٹھنڈا تھا، دسمبر کی اسی کالی رات کی طرح یخ بستہ!

دو ماہی شیرازہ، سرینگر
"افسانہ نمبر" ۱۹۷۷ء

ٹیسیں درد کی

یادوں کی پھیلی ہوئی وادیوں میں کبھی کبھی تمہاری شبیہہ گھومنے لگتی ہے،
اور میں اس شبیہہ کو اندھے مسافر کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چھونے لگتا ہوں۔ اور تمہارے
وجود کا احساس کر کے کٹ جاتا ہوں۔ تمہارے کتنے ہی رُخ، کتنے ہی زاویئے
سامنے آجاتے ہیں۔ کبھی دھول میں اٹا ہوا سیاہ چہرہ اور کبھی نور کے ہالے میں
جگمگاتی ہوئی روح ___ کبھی تمہاری ہوس کاریوں کی سیاہی اور کبھی تمہاری بھاونا
کی قوسِ قزح ___ میرے بے ہودہ خیالات ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں
اور خود میرا سارا وجود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ ششی کے ساتھ تمہارا راز و نیاز
ایک معمّے سے کم نہ تھا۔ تم کیسے اُس کے جھانسے میں آگئیں۔ اِس کے بارے میں
میں کبھی حتمی فیصلہ نہ کر سکا۔ ششی کے مقابلے میں میں جب تمہارے سامنے آیا۔
تو یہ بات تسلیم کی جا سکتی تھی۔ تم میرے مردانہ جلال پر لٹو ہو جاؤ گی۔ ششی
عمر میں کافی سینئر تھا۔ اور میں کم عمر اور نوخیز! ششی جوانی کی سرحدوں کو پاٹ

چکا تھا اور اس کی کنپٹیوں پر اُس کے سفید اُگے ہوئے بال اُسے رد کر دینے کے
لئے کافی تھے۔ لیکن تم نے ان بالوں کو چوم لیا، اس کی آنکھوں کے گرد جو حلقے
پڑے ہوئے تھے۔ تم نے اِن حلقوں کی زنجیر کو اپنے کنوارے سینے سے لگا لیا
اور میرے ہونٹوں کی بے پناہ لالی اور رخساروں کے گلابی رنگ اور لہجے کی
شاعری اور نفاست و نزاکت کو ایک آنکھ بھی نہ دیکھا، ششی اور تمہاری داستانِ
عشق میرے لئے قصۂ امیر حمزہ بن گئی اور میری کھلی آنکھوں کے سامنے تم ——
تم نے اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دیا۔
کافی عرصے تک میں اسے محض تمہاری جوانی کا اُبال سمجھتا رہا۔ تم دونوں
کا سنگم عقل کے تمام تقاضوں کی نفی کرتا تھا۔ میری موجودگی میں تم میرے وجود
کو نظر انداز کر دیتیں، اور اپنی کاجل کی لہروں میں ڈوبی ہوئی سرمئی نظروں کی
مسکان کو ششی اور صرف ششی کے لئے وقف کر دیتیں تو مجھے ان نگاہوں
میں خیام کی رباعیوں کی مستی نظر آئی، مجھے تمہارا جسم جلتا ہوا محسوس ہوتا اور
انگ انگ میں بے چین شراروں کی چٹاخ چٹاخ چنار کے سرسراتے ہوئے پتوں
کی یاد دلاتی۔ اور ششی —— گہری نظروں سے تمہارے پھوٹتے ہوئے انگوں
کا نظارہ کرتا۔ سوکھے گلے کو صاف کرنے کے لئے بار بار تھوک نگلتا رہتا۔
مجھے ہنسی آتی۔

اور پھر ششی کے اِس انکشاف پر کہ تم مذہب کے محدود دائرے
کے حصار کو چھوڑ کر آزاد خیال بن گئی ہو اور کہ تم نے ہیگل اور مارکس کے
فلسفے کو اپنا ایمان بنا لیا ہے۔ مجھے اپنی ہنسی روکنا پڑتی، میں اس بات کو
کس طرح تسلیم کرتا کہ تم نے ایک کٹر قسم کے مذہب زدہ خاندان کی قدیم
روایات کو تج دیا ہے۔ تم تو ہر بات مذہب کے منبر پر چڑھ کر کرتی تھیں۔
تمہارے لہجے میں مذہب کی گہری چھاپ تھی۔ تمہارے آدابِ زندگی، تمہارے

گھریلو ماحول کے پروردہ تھے۔ جہاں صدیوں سے مذہب کے گھرے سائے منڈلاتے رہے تھے۔ اس لئے ششی کے اِن بیانات کا میں نے ہمیشہ یہ کہہ کر مذاق اُڑایا کہ وہ بک رہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت بار ششی سے چخ چخ بھی ہوئی۔ دوستوں کے حلقوں میں ششی صرف یہ ڈینگ مارا کرتا تھا کہ وہ سیاسی لحاظ سے ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ کم از کم عورتوں کے طبقے میں ایک حلقۂ اثر پیدا کر رہا ہے۔ اس نوعیت سے ششی کا یہ عشق، سیاسی عشق تھا۔

ایک دن ششی نے یہ مژدہ سنایا کہ تم دلہن بن رہی ہو۔ ششی کے چہرے پر سے میں کچھ بھی نہ پڑھ سکا، اُس کا چہرہ بے لکھے کاغذ کی طرح کورا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن میں نے ششی کا مذاق اڑایا۔ مجھے یاد ہے کہ اس واقعہ کے چند دن بعد جب تم رات کے جگمگاتے ہوئے قمقموں کی روشنی میں دُلہن کا سنگار کئے، مسکراہٹوں کے گلاب بکھیرتی ہوئی دھیمے دھیمے ایک سجے ہوئے دیوان پر جلوہ افروز ہوئی تھی۔ تمہارے صندلی بدن سے خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں، تمہاری ہر نظر قیامت تھی اور تمہارا ہر خم اور ہر قوس توبہ شکن ــــ ششی بے وقوفوں کی طرح تمہیں تکے جا رہا تھا۔ اور میں سگرٹوں کے دھوئیں میں بکھر جانے کی کوشش کر رہا تھا ــــ دل میں جذبات کا تلاطم تھا۔ تمہارا قرب اب تمہارے سہاگ کے دبیز پردے کے نیچے دب چکا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں نہ آنسو تھے اور نہ ہی تمہارے ماتھے پر ملال کے سائے، دنیا بھر کی خوشیاں تمہارے جگمگاتے ہوئے دامن میں تھیں۔ برات آئی، بینڈ بجایا گیا، آتش بازی چھوٹی، رسومات انجام پائیں اور تم اپنے دُلہے کی جلتی ہوئی باہوں میں کسمسانے کے لئے چلی گئیں۔

سہاگ کی مہندی ابھی سوکھنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ تم واپس لوٹیں ــــ

کیوں ؟ میں اس بات کی تھاہ نہ لے سکا۔ تمہارے دُلہے کا کیا ہوا ؟ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ـــــ تم نے طلاق لے لی۔ ششی کے تعلقات حسب معمول استوار ہوئے۔

تم نے ایک بچی کو جنم دیا۔

بچی کا باپ کون تھا ؟

تمہارے دُلہے نے تو اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔

پھر ششی ـــــ ؟

یا ـــــ

یہ بات آج بھی ایک معمّہ ہے۔

لیکن جب میں تمہاری عیادت کے لیے ہسپتال آیا۔ تو تمہارا سارا حسن پھیکا پڑ چکا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں حسرتوں کی بجھی ہوئی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

میرا دل بھر آیا۔

میں نے تمہارے ماتھے کو چوم لیا تم دیکھتی رہ گئیں اور ایک بیمار سی مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ تمہاری گہری سیاہ آنکھوں میں مجھے نمی سی تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ غم کے آنسو تھے یا خوشی کے ؟ میں سمجھ بیٹھا شاید میری تپسیا رنگ لائی ہے اور تمہارے یہ شبنمی آنسو پراشچت کے آنسو ہیں اور بہار کے پھول میرا انتظار کر رہے ہیں۔

لیکن یہ میرا بھرم تھا۔

وقت بہتا گیا۔ ششی اور تمہارا تقرب ایک نیا رنگ لایا۔ خبر آئی تم ماں بن رہی ہو ـــــ ششی کے بچے کی ماں ! میری آنکھیں حیرت سے جم گئیں۔ تم نے ـــــ ششی کے ساتھ جیون بتانے کا فیصلہ کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ ششی شادی شدہ تھا۔ چار بچوں کا باپ ایک بھرے پُرے گھر کا سربراہ ـــــ اور پھر مذہب کی لکشمن ریکھا کو تم نے کیسے مِٹا دیا تھا۔ میں ہر تھام کے رہ گیا لیکن افسانہ، حقیقت کے رنگ میں ڈھل چکا تھا۔

تم ایک گزیٹڈ آفیسر بن گئیں اور ششی کی پریکٹس بھی خوب چلی۔ تم ساتھ رہنے لگے۔ میاں اور بیوی کی طرح۔ اِس گندے اور تنگ نظر معاشرے میں جہاں ہر سیدھی بات کو غلط معنی سمجھا جاتا ہے۔ اس ان مل بے جوڑ بیاہ کو کس طرح قبول کیا گیا۔ نہ جلسے ہوئے اور نہ ہی سیاہ پرچم لہراتے ہوئے جلوس دیکھے گئے، نہ کوئی طوفان اُمنڈ پڑا ـــــ اور نہ کوئی ملک گیر فساد نمودار ہوا ہاں کچھ بزرگ قسم کے لوگوں نے اپنی پگڑیوں کو تھام کے کہا تھا۔"

"خدا کا قہر ٹوٹ پڑے اِس گھر پر جہاں گناہ کی بے راہ روی ہے"

اور بعض ماؤں اور بہنوں نے نل پر پانی بھرتے ہوئے کانا پھوسیاں کی تھیں۔

ششی نے اِس ملامت کا مقابلہ کیسے کیا۔ اِس کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن تم نے ایک دن گلی کے نکڑ پر کھڑے ہونے والے لوگوں سے دو ٹوک کہا تھا۔

" اے لوگو! یہ آدمی جس کی طرف تم مشکوک نگاہوں سے تکے جا رہے ہو، تمہارا داماد ہے۔ جس نے تمہاری بیٹی ـــــ مجھ سے شادی کر لی ہے۔ کسی مائی کے لال نے ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لیا، آنکھیں پھوڑ دوں گی۔"

اور پھر دبی دبی سرگوشیاں ہمیشہ کے لئے سو گئیں۔ اس کے بعد کوئی کج نگاہ ششی کی طرف نہیں اٹھی ـــــ تمہارے اس جلال کو دیکھ کر ہی بھونچکا رہ گیا۔ اور پھر صدیوں تک تم دونوں ـــــ عشق کے جھولے میں پینگیں لیتے رہے اور نظروں سے کھو گئے۔

لیکن ششی پھر نمودار ہوا۔

اِس بار اُس کے ہونٹوں پر شکایت تھی کہ تم بے حیا ہو۔ سادیت پسند ہو حد سے زیادہ شہوت پرست ہو اور یہ کہ تم اس کی غیر حاضری میں غلاظت سے لتھڑ گئی ہو۔ تم ہر ایرے غیرے کے سامنے اپنے آپ کو سپرد کرنے کو تیار رہتی ہو۔

تمہارا جسم داغ دار ہے۔ اور روح بے حس۔ لیکن میرے شوقِ تجسس نے جب اِس الزام کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ تو معاملہ اُلٹا تھا۔ میں نے تم کو سراپا ایثار پایا۔ ششی نے اب سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے اُس کی پریکٹس رُک گئی تھی۔ تم اس کے لئے کیا نہیں کر رہی تھیں۔

اُس کو دوہرانا عبث ہے۔ جیل میں بیماری کی حالت میں ہی ششی کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ اُس کا اپریشن ہوا۔ تو میں نے خود اپنی کھُلی آنکھوں سے دیکھا کہ تم نے ایک ماں کا روپ دھار لیا تھا۔ تم نے ششی کے لئے کتنی ہی راتوں کی نیندیں ضائع کر دیں کتنے ہی دن آنسوؤں کا سیلاب بہایا۔ میں نے تمہارے ہاتھ کتنی ہی بار دعا میں اُٹھتے دیکھے۔ تم نے کتنے ہی آستانوں پر جا کر منت مانی، کتنے ہی سجدے کئے۔ یہ سب واقعات

اس وقت میرے من کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ اور جب ششی نے صحت کا غسل کیا۔ تو تم نے جشن منایا۔ خیرات سے بھک منگوں کو نہال کر دیا۔ شمعیں جلا کر قریب کی زیارت گاہوں میں چراغاں کیا۔ اپنے تن بدن کو گروی رکھ کر ششی کی تمام چھوٹی اور بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ اس کے بچوں پر جان نچھاور کر لی۔

میرا سر جھک گیا۔

لیکن ششی تمہارا عاشقِ زار، تمہارا روبو، تمہارا گرو۔ تم سے دور ہوتا گیا۔ تمہاری کوکھ سے دو اور بچے پیدا ہوئے۔ ششی تمہارے پاس رہتے۔ وقت ان کو سب کچھ سمجھتا۔ ایک باپ کی شفقت اور پیار دیتا۔ لیکن جب تم سے کٹھ جاتی تو اُس کے منہ سے پھول جھڑتے۔ مجھے بعض اوقات اس کی باتوں میں سچائی کا شبہ ہوتا۔ اور مجھے تم سے نفرت ہو جاتی کہ تم عصمت باختہ ہو۔

سات سال بیت گئے۔

میں نے تمہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا حالانکہ تم سے ملنے اور تم سے باتیں کرنے کی خواہش ہزار بار میرے من میں جاگ اُٹھی۔ کبھی کبھی میرا دل مسوس

ہو اٹھتا۔ لیکن تم کہاں نہیں؟ میں نے تمہارے تیاگ کی کتنی ہی باتیں لوگوں سے سنیں۔ کئی بار ششی سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بیانات میں تضاد ہوتا۔ کبھی پیار کی تمام خوشبوئیں تمہارے لئے سمیٹ لاتا اور کبھی شیطانی جذبے سر منڈلاتے ہوئے نظر آتے۔ میں دیوانوں کی طرح اسے صرف دیکھے جاتا تھا۔

ششی اب عمر کی ایسی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں بڑھاپے کے تپتے ہوئے ریگ زار نظر آتے ہیں جنہ آرزوؤں کے دن تھے اور نہ مرادوں کی راتیں — آنکھوں کی بصارت جواب دے چکی تھی۔ کانوں میں نقص پیدا ہو چکا تھا۔ ذمہ داریوں کے سانپ اپنے زہریلے پھن پھیلائے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ اس کی پہلی بیوی کے بچے جوان ہو چکے تھے۔ سوسائٹی اب اُس کے عشق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

ششی کے اور تمہارے تعلقات منقطع ہو گئے
تم پر کیا گزری، میں کہہ نہیں سکتا
ایسے وقت میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا۔

پھر خبر ملی کہ تم بہت بیمار ہو۔ ہسپتال میں ان ڈور ہو گئی ہو اور تمہیں گلیوکوز دیا جا رہا ہے۔

ششی کو خبر مل چکی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "اب کیا کیا جائے"؟ وہ پریشان لگ رہا تھا —

ہم دونوں تمہاری عیادت کے لئے ہسپتال پہنچے — لیکن دیر ہو چکی تھی — تم جا چکی تھیں۔ ہیلو کہے بغیر، ملے بغیر، مسکرائے بغیر —

نرس نے بتایا کہ آخری ہچکیوں تک تم دروازے کی طرف ٹکٹکی، لگاہوں سے کچھ کھوجتی رہی تھیں۔

میں سر پکڑ کے رہ گیا۔

ششی کی آنکھوں میں بے پناہ آنسو تھے

تم تو لکشمی سروپ تھی اما۔ تو نے یہ کیا کیا

میری آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں۔ جی کرتا ہے دھاڑیں مار مار

کر رو دوں، لیکن آواز رندھی ہوئی ہے۔ اور گلے میں اٹک گئی ہے۔

دل کے کسی انجان کونے میں درد کی بے پناہ ان بوجھی ٹیس ہے۔

ان ہی ٹیسوں کی مالا تمہارے مزار پر پہنا کر تمہیں آخری سلام بھیج

رہا ہوں۔

اور کر ہی کیا سکتا ہوں ——؟

ماہنامہ سب رنگ بمبئی

۱۹۷۵ء

لمحوں کی راکھ

رات کتنی بھیانک ہے!

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ چاروں طرف اندھیرے کے
گھنے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ میں گم سم سناٹے کی آواز
پر کان دھرے من کے کیواڑ کھولے ہوئے دیکھتا جا رہا ہوں۔ پسینے میں
شرابور، دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ لگتا ہے جیسے کوئی طوفان
جاگ رہا ہے۔ اس کونے میں میری بیمار بیوی لیٹی ہوئی ہے۔ دو مہینے سے
بیمار ہے۔ اس کی پرانی بیماری لوٹ آئی ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اسے
موت کے منحوس سائے سے دور رکھوں مگر وہ خون تھوک رہی ہے۔

وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ میرے ٹوٹے ہوئے گھروندے کی مالکن
بس دن رات ایک کر کے صبح سے شام تک پڑھا پڑھا کر کماتا ہوں تاکہ
اس کی زندگی کا سورج ڈوب نہ جائے۔ اور اسکی آنکھوں میں حسرتوں کے آنسو
نہ رہ جائیں۔ لیکن اسے کون سا گھن کھائے جا رہا ہے؟ میرا ذہن شل ہو چکا

میری آنکھوں سے حسرتوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں ــــ پاس ہی بچے سر اوندھائے سو رہے ہیں۔ ان کے بچپنے کے خواب بھی جیسے روٹھ گئے ہوں۔ اندھیرے کے اس دبیز پردے کے پیچھے سے ان کی سہمی سہمی آنکھوں کی خاموشیاں اور مایوسیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ یہ سہمی سہمی آنکھیں پھیل جاتی ہیں۔ اور الماس کے بے رنگ چہرے میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں۔ "ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ..... مجھ سے کیا لینے آئی ہو؟ اب تو دس سال بیت چکے ہیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں چلا آیا ہے۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ اور میرے خوبصورت چہرے پر وقت کے تھپیڑوں کے نشان صاف نظر آتے ہیں۔ میں اس دن بھی تم سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ جب تم میرے مردانہ جلال پر لٹو ہو گئی تھی۔ تم میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک یوں ہی سی صورت خالی خولی جسم، نہ کوئی قوس اور نہ کوئی زاویہ، ایک بے ڈھنگی مردانہ آواز ..... آوازیں تو مجھے اس وقت بھی رستی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے سناٹوں نے آوازوں کو میرے ارد گرد گھیر لیا ہو۔ یہ آوازیں اس وقت میرے من کے سناٹے میں گونج رہی ہیں ــــ

اور میں نے الماس کی آوازوں کو روند ڈالا ــــ تم نے اپنے طور مجھ سے خوب انتقام لیا۔ تم راج کی باہوں میں جھول گئیں۔ اور میری طرف ایک آنکھ بھی نہ دیکھا۔ میں تمہارے تیاگ اور تپسیا کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ تمہاری بے رنگ آنکھوں میں عشق کی قوسِ قزح جھلملانے لگی۔ راج کے جیومیٹری بکس نے تمہارے جسم کے خالی کاغذ پر کتنی ہی قوسیں اور کتنے ہی ٹیڑھے میڑھے خطوط ابھار دیئے۔ سارے گڑھے بھر گئے اور تمہارا جسم ایک جنسی بلاؤز بن گیا۔ اور میں ــــ تبسم کی آنکھوں میں کنول کے پھول تلاش کرتا رہا۔ جس جذبۂ شوق کو لے کر تم میرے سایوں کے

پیچھے بھاگتا رہی تھیں ایسی گداز نے مجھے تبسم کی مسکراہٹ چومنے کے لیے بے قرار کر دیا۔ ہم دونوں کی دنیا ایک جیسی ہوتے ہوئے بھی کتنی دور تھی۔ تمہیں پاتال کی تلاش تھی اور مجھے آکاش کی کھوج۔

آکاش پر سیاہی چھائی ہوئی ہے۔ تارے اندھیرے کے قبرستان میں دفن ہو چکے ہیں۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔ گھٹا ٹوپ تاریکی ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا مر چکی ہے میرے کمرے میں کتابوں کے اس ڈھیر کے قریب اب ایک سگریٹ سلگ رہا ہے۔ کوئی دھوئیں کے مرغولے فضا کی تاریکی میں بکھیر رہا ہے۔ دُھواں ہی دھواں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کڑوا کسیلا دھواں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاجل کے گھنے سائے میں ڈوبی ہوئی نیلی آنکھیں پھر بلا رہی ہیں۔ لیکن جوں ہی آگے بڑھتا ہوں۔ آنکھوں کے دریچے بند ہو جاتے ہیں۔ خاموشی ۔ ۔ ۔ ۔ مکمل خاموشی کوئی آواز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے چاند اچانک گہنا جائے ساحر میں کٹ کے رہ جاتا ہوں۔ دراصل میں چُغد ہوں، منٹو کا چغد، عشق کی قوس قزح کو تھامنے کے لئے فنکار ہاتھوں کی ضرورت ہے جو دُور دُور تک پھیل سکیں۔ جہاں حیا کا اُجالا بھرہ دینا ہے۔ حُسن کے مندر میں آرتی کون اُتارے۔؟

تبسم ۔ ۔ ۔ ۔ چاند ۔ ۔ ۔ ۔ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ چاند کی طرف دیکھ کر آہیں بھرنے کا زمانہ بیت چکا ہے۔ چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آج ہر ملک کی تجربہ گاہوں میں پڑا ہوا ہے۔ گُھٹ گُھٹ کر گھل جانے کی فرصت کہاں؟ پرانے لوگ سودائی تھے چاند سے عشق کرتے تھے —— —— چاند اور عشق؟ بات نہیں بنتی ۔ ۔ ۔ ۔ !

زندگی اِن منزلوں تک آگئی ہے جہاں سفید بالوں کی جھاڑیاں صاف نظر آنے لگی ہیں۔ پھول مرجھا گئے۔ تو ان کی مہک بھی مر جائے گی اور باغ ۔ ۔ ۔ ۔ باغ میں اُلو بولنے لگیں گے۔

اُف حبس سا طاری ہو رہا ہے۔ سانس رُک سی گئی ہے۔ تاریکی کے اِس اتھاہ سمندر میں کوئی چپو مار رہا ہے۔ کوئی آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتا آرہا ہے۔ میری آواز گلے میں اٹک کے رہ جاتی ہے۔ کوئی آسمانی طاقت.....؟ میرا ضمیر......؟

کل صفاکدل میں آٹھ آدمی جل کر راکھ ہو گئے۔ بیچارے..........

عبرت کا واقعہ ہے لوگ کہتے ہیں گناہ کئے تھے۔ چار بچوں کی ایک ماں اور چار بچوں کا ایک باپ مستقبل کی ساری اُمیدیں لئے جل گئے۔ ایک نئی دُلہن سہاگ رات کی سیج پر جل کر راکھ ہو گئی۔ اور چار بچے اپنی فرشتوں کی سی معصومیت اور پاکیزگی کا تاج سر پہ لئے اللہ میاں کے دربار میں باریاب ہو گئے۔ اور..... اور ہم نے کتنے گناہ کئے ہیں۔ کتنے جھوٹ بولے ہیں۔ کتنی چوریاں کی ہیں۔ کتنے دل توڑے ہیں۔ کتنی ریاکاریاں گلے سے لگائی ہیں کتنے...... چاروں طرف آگ سی جلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اور میں جل کر راکھ ہو جاتا ہوں۔ کہیں دور کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے وہ جو اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ وہ جو کاغذی سڑکیں بنا کر سرکاری خزانے کو لوٹتے ہیں اور وہ جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے ان کی آنکھیں نکال کر بھیک مانگنے کا پیشہ سکھاتے ہیں۔ اور وہ جو احمد آباد میں مذہب کے نام پر لوگوں کو زندہ جلاتے ہیں۔

اور وہ جو..... میری راکھ میں پھر سے چنگاریاں سلگنے لگتی ہیں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا ــــــ مجھے گیان و عرفان کی ضرورت ہے ذہن میں بھگوت گیتا کے اشلوک تازہ ہوتے ہیں..... نہیں نہیں..... مجھے بدھ کا تیاگ چاہیئے..... مجھے عیسیٰؑ کے صبر کی ضرورت ہے۔ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے آواز دے رہی ہے.....

سناٹے کی ان بے پناہ ویرانیوں کو چیرتی ہوئی پکار... پرماتما ؟ آسمانوں سے کوئی پُراسرار بلاوا ؟ آرم سٹرانگ آسمانوں کو پھاندتا ہوا چاند کے نورانی چہرے کو روندتا ہوا صحیح وسلامت واپس لوٹ آیا ہے.... اور سیاہ فام مارٹن لوتھر کنگ کا خون اب بھی بہہ رہا ہے اور چندی گڑھ کا حسن فق ہو گیا ہے ــــ اور میرا سر گھوم رہا ہے۔

وقت بیتتا جا رہا ہے لمحے بہتے جا رہے ہیں۔ کمرے کے اس کونے میں میری رفیقۂ حیات کراہ رہی ہے۔ شاید سینے میں پھر درد ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اور آنسوؤں میں حسرتیں........ اور آج ۲۶ تاریخ ہے۔ میری جیب خالی ہے۔ اور دوائیوں کا سٹاک ختم ہو چکا ہے۔ بوتلیں پاس کے طاق پر لڑھک گئی ہیں۔ اور یار لوگ کہتے ہیں۔ تمہاری چاندی ہے۔ کتنے کا بینک بیلنس ہے۔ اب تو ٹکسال بن چکے ہو۔" لینڈ لیڈی نے میرے بچے کو پھر صبح صبح کوسنے دیتے ہیں۔ لاٹ صاحب کی اولاد! لوگوں کا گھر اُجاڑ چکے۔ اب میرا گھر مسمار کرنا ہے دفع ہو جاؤ یہاں سے، جیسے تمہارے بابا کا گھر ہے..... میں بچے کی آنکھوں میں سویرے سویرے شبنم کے دو قطرے دیکھ چکا ہوں۔ ایک عجیب سی اتھل پتھل ہے من میں۔

اُف یہ رات کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ تاریکی اپنے خونخوار جبڑے کھولے میری طرف بڑھ رہی ہے۔ سویرا کب ہوگا ــــ ؟ سویرا کبھی نہیں ہوگا۔ ملک میں سیاسی افراتفری ہے قومی کردار تار تار ہو رہا ہے۔ طبقاتی کشمکش...... لورژادا.... پرولتاریہ..... سوشلزم..... سیاسی پارٹیاں چاروں طرف بلیک میلنگ ہو رہا ہے

راج نے بھی تو الماس کو بلیک کر دیا...... راج ایک جسم

فروش مرد ہے۔ عشق اس کا پیشہ اور عورت اس کی اہم ضرورت — اس نے کتنی ہی جوان بیواؤں کی نفسانی خواہشات کو بجھایا۔ کتنی ہی ناآسودہ سہاگنوں کی سلگتی ہوئی آگ کو بھڑکایا۔ اس کی صورت دکان، اُس کی مسکراہٹ اس کی جنسی تجارت — زندگی کی اس منزل پر آکر اس کے جنسی جذبات سرد ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی امساک کی گولیاں کھا کھا کر اُس نے جذبات کی ہانڈی کو اپنے جسم کے ساتھ کھینچ رکھا ہے۔ الماس نے اپنا مذہب، ایمان، دولت اور جسم سب کچھ راج پر نثار کر دیا۔

راج اُس کے جسم کے بدلے اُس کے زیوروں کو چھین کر اپنی بیاہتا بیوی کے زیورات بناتا رہا۔ اپنی مسکراہٹ کے عوض الماس کی ایک ایک کوڑی خریدتا رہا۔ اور اس سے اپنی آسائش کا سامان کرتا رہا۔

اس کے جسم کے انگ انگ کو مسل کر اس کی کوکھ میں ایک بچہ رکھ دیا اور بچہ بے نام ہے۔ بے باپ ہے۔ اس کے بچے کا کوئی مذہب نہیں۔ کوئی جسم نہیں، کوئی روح نہیں۔ اُس نے منٹو سے لے کر ہیگل اور مارکس تک سارے فلسفے کو چاٹ لیا ہے۔ راج کی خاطر!

اس کے سامنے صرف ایک سوال ہے اس کے بچے کی مسکراہٹ کا ضامن کون ہے؟

راج؟ — جس نے گناہ کی تپتی ہوئی ریت پر اس کے کنوارے بدن کو گلے لگایا۔

فلسفہ؟ — جہاں خشک اور سپاٹ دلائل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سماج؟ — جو نہ اسے ہندو ماننے کے لئے تیار ہے نہ مسلمان ماننے کیلئے۔

الماس چلی جاؤ — میری نظروں سے ہٹ جاؤ اور بھگت لو اپنے

گناہوں کی سزا ــــ ! لیکن میں ہانپ کیوں رہا ہوں ۔؟

میری سانسیں اٹک سی کیوں گئی ہیں؟ یہ دل میں عجیب سی بے نام سی بیقراری کہاں سے چلی آئی ہے؟

تبسم ! میری جان ! یہ تم ہو ؟

وہی دراز بال وہی مستانہ روی، وہی آنکھوں کی نیلی جھیلیں، وہی گالوں کے سیب۔ وہی سپنوں کی شام، ٹھہر جاؤ میں تمہارے دراز بالوں کو تھام لوں۔ ـــ سُرمئی سایوں میں ڈھکی ہوئی تمہاری نیلی جھیلوں میں جھانک لوں۔اور کنول کا ادھ کِھلا پھول کھوج لوں۔ . . . . . ! تمہارے انتظار میں میری آنکھیں پک گئی ہیں۔ لیکن تم ہٹ کیوں رہی ہو؟ تمہاری نیلی جھیلوں میں یہ سفید دھارائیں کہاں سے آگئیں؟ کیوں ــــ؟ کنول کا وہ ادھ کِھلا پھول بھی . . . اُف ! میں پاگل ہو جاؤں گا۔

میں نڈھال ہو چکا ہوں، سارا جسم لوٹ رہا ہے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ چاروں طرف ایک طوفان گرج رہا ہے۔ جیسے کوئی کشتی طوفانی لہروں میں گھری ہوئی ڈول رہی ہو۔ دیواریں ہل رہی ہیں۔ میرے دماغ پر کوئی زور زور سے ہتھوڑے برسا رہا ہے یہ اندھیرے لمحے راکھ ہوتے جا رہے ہیں تاریک جنگلوں میں ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی ہے۔ بے بسی ہاتھ پھیلائے میری طرف بڑھتی جا رہی ہے اور میرے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ رہے ہیں ــــ

ماہنامہ فلمی ستارے دہلی

۱۹۷۰ء ـــ

امر جیوتی

یہ واقعہ ۱۹ ر ستمبر ۱۹۴۴ء کا ہے۔ بیل گریڈ پر روسی فوجوں کا اقتدار چھا چکا تھا۔ صرف ساوندی کا پل جرمنوں کے قبضہ میں تھا۔ اُس دن صبح سویرے پانچ لال سپاہیوں نے چھپتے چھپتے اُس پل پر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اُنہیں صرف ایک "چوکور" سی درمیانی جگہ کو پار کرنا تھا۔ جہاں ہماری اور جرمنوں کی بہت لاریاں جلی پڑی تھیں۔ وہاں ایک درخت تک گولیوں کی بے پناہ بوچھاڑ سے صحیح وسالم نہ بچا تھا۔ اُس "چوکور" سی جگہ پر ہمارے کچھ فوجی جوان پکڑ لئے گئے تھے۔ اور وہاں وہ پانچ لال سپاہی گھنٹہ بھر گولیوں کی بارش تلے پڑے رہے۔

اور جب گولیاں چلنا رک گئیں۔ تو اُن میں سے دو زخمی جوان اپنے سے زیادہ دو گھائل جوانوں کو گھسیٹ لائے۔ پانچواں سپاہی وہیں مر گیا۔

میں اُس پانچویں سپاہی کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ کمپنی کے حاضری رجسٹر میں اُس کا نام "چیک پولیو" تھا اور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کی اُس منحوس

صبح کو سوا ندی کے کنارے اُس نے اپنی جان دی۔ لال سپاہیوں کے وہاں اِس طرح چپکے چپکے پہنچ جانے سے جرمن حد درجہ گھبرا گئے تھے۔

اگلے دِن کمپنی کمانڈر نے "چیک پولیو" کی لاش کے پاس جانے کی اجازت نہ دی۔ اِستفسار پر اُس نے جواب دیا کہ پُل پر پورا تسلط ہوتے ہی لاش کو اعزاز کے ساتھ دفنایا جائے گا۔

جرمن، دِن بھر گولے برساتے رہے۔ پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں سے اُس چوکور سی زمین کے کنارے ایک چھوٹا سا مینار بن گیا تھا۔ اور یہ بتانا مشکل تھا کہ پہلے وہاں کیا تھا۔ لیکن اصلیت یہ تھی کہ اُس ملبے کے نیچے ایک چھپا ہوا تہہ خانہ تھا۔ جہاں ایک بوڑھیا رہتی تھی۔ وہ پہلے تہہ خانے کے اوپر والے حصے میں رہا کرتی تھی۔ لیکن جب وہ تباہ ہو گیا۔ تو وہ نچلے حصے میں چلی گئی۔ دوسرے لوگوں نے تو پہلے ہی یہ جگہ چھوڑ دی تھی۔ لیکن بوڑھیا نے اس پوشیدہ تہہ خانے سے ٹلنے کا نام نہ لیا۔ اس کا نام میریا جوکش تھا۔

۱۹ ستمبر کی اس اندوہناک صبح تک بوڑھیا کو اِس گولیوں سے چھدے ہوئے تہہ خانہ میں رہتے پورے چار دن رہ گئے تھے۔ دِن چڑھنے سے پہلے اُس نے اِن پانچ لال بہادروں کو آہستہ آہستہ رینگتے دیکھا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ کس طرح جرمن اُن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ اُن کو بُلانے کے لئے اپنی خفیہ رہائش گاہ کے دروازے تک بھی آئی۔ لیکن جونہی وہ وہاں پہنچی، ایک گولہ پاس ہی آ کر گرا۔ زور کا دھماکہ ہوا۔ بوڑھیا کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بیہوش ہو کر وہیں گر پڑی۔

بوڑھی میریا جب تھوڑی دیر کے بعد کچھ سنبھلی تو پانچ سپاہیوں کے بجائے اُس نے وہاں صرف ایک کو پایا۔ وہ حیرت سے ہکا بکا رہ گئی۔ وہ جوان اپنا ایک ہاتھ باہر اور دوسرا سر کے نیچے رکھے پڑا ہوا تھا۔ میریا نے اُسے کئی بار پکارا مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ آہ! وہ مر چکا تھا۔

جرمنوں نے پھر گولے برسانا شروع کر دیئے۔ دھوئیں کے کالے کالے بادل ساری فضا پر چھا رہے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں لیکن وہ لال سپاہی وہیں اپنے ہاتھ پر سر رکھے لیٹا رہا۔ ایک لمحہ تک میریا اُسے عجیب نظروں سے گھورتی رہی۔ وہ اُس کے بارے میں کسی سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جس سے وہ بات کر سکتی۔ اُس کی پیاری سہیلی بلی بھی پچھلے دھڑاکے میں دیوار سے گر کر مر چکی تھی۔

بڑی دیر تک وہ اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہی۔ آخر کسی خیال کے اچانک پیدا ہوتے ہی اندر چلی گئی۔ اور اپنی کالی چادر میں کچھ چھپا کر واپس آئی اور تہہ خانے سے باہر نکل پڑی۔ وہ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ خراماں خراماں چلنے لگی۔ جرمن گولے برساتے رہے اور وہ ہر ما بچتی رہی۔ میدان پار کر کے وہ اُس سپاہی تک جا پہنچی۔

وہ لال سپاہی شباب کی تمام سرمستیاں لئے ہوئے تھا مگر اب اُس کا گلنار چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ موت نے اُس کی جوانی کے سب رنگ چھین لئے تھے۔ بڑی دقت کے بعد میریا نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیریں جیسے وہ اُس کا اپنا بیٹا ہو۔

جرمن گولے برساتے رہے اور وہ ہر بار بوڑھیا سے دور گرتے رہے لگ بھگ دو گھنٹے وہ اُس کے پاس بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

سناٹا چھا چکا تھا وہ اُٹھی اور کچھ دور ایک گڑھے کے پاس جو بارش

کے پانی سے بھرا ہوا تھا، رُک گئی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُس نے پانی نکالا

اس کے بعد وہ اُس ابدی نیند سوئے ہوئے لال بہادر کے پاس اُسے گھسیٹ کر لے گئی۔ اتنی دُور گھسیٹنے میں اُسے تین چار مرتبہ سستانا پڑا آخر بوڑھیا نے اُسے گھڑے میں ڈال دیا۔ یہ سب کر کے وہ بہت تھک گئی۔ وہ کمر درد سے کراہ اُٹھی۔ پاؤ گھنٹے تک وہ چُپ چاپ لیٹی رہی اور اپنی کمر کو سہلاتی رہی۔

اور جرمن گولے برساتے رہے۔ آرام کر لینے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اپنی بوڑھی اُنگلیوں سے اُس کے جسم پر "کراس" کا نشان بنایا۔ اُس کے مردہ ہونٹوں کو چوما اور پھر اِدھر اُدھر سے مٹی لا لا کر اُس گھڑے کو بھر دیا۔ مگر پھر بھی اُس کی تسلی نہ ہوئی۔ تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد اُس نے اپنی کالی چادر سے اس چیز کو نکالا جسے وہ تہہ خانے سے ساتھ لائی تھی۔ یہ ایک موم بتی تھی۔ یہ موم بتی لگ بھگ ۵۴ سال پہلے اُس کے بیاہ کے دن جلائی گئی تھی۔ جیبوں کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اُسے ایک دیا سلائی مِلی قبر کے ایک کونے پر اُس نے موم بتی جلا دی۔

اندھیری رات تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ موم بتی کی لو اُٹھنے لگی اور آس پاس اندھیارے کو مٹانے لگی۔ وہ بوڑھیا قبر کے سرہانے چادر میں لپٹی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔

گولے گرتے رہے۔ موم بتی جھلملاتی رہی۔ کئی بار بُجھنے بھی لگی۔ بوڑھیا صبر و استقلال سے اُسے ہر بار بچاتی رہی۔

سویرا ہونے لگا تھا۔ آدھی موم بتی جل چکی تھی۔ تلاش کرنے پر بوڑھیا کو ایک ٹین مِلا۔ ہوا کے جھونکوں سے اُسے بچانے کے لئے

اُس نے موم بتی کو ڈھانپ دیا۔ اور پھر چپ چاپ تہہ خانے کی طرف لوٹی

صبح کی سفید روشنی پھیلتے ہی لال سپاہیوں نے اُس پُل پر قبضہ کر لیا۔ دو گھنٹے تک اُس پار سناٹا چھایا رہا۔ دوسرے کنارے پر لڑائی جاری تھی۔

کمپنی کے کمانڈر کو جب اُس مرے ہوئے سپاہی کی یاد آئی تو اس نے اس کو تلاش کرنے کی اجازت دی۔

میدان کے اُس کنارے ایک فوجی جوان حیرت میں کھو کر چلا چلا کر دوسروں کو بُلانے لگا۔ "دیکھو دیکھو!" وہ چلّایا۔ سب اُدھر دیکھنے لگے۔ مٹی سے ڈھکا اور اُبھرا ہوا ایک گھڑا دکھائی دیا جس کے کونے پر ٹین سے ڈھکی ہوئی موم بتی جل رہی تھی۔ وہ ختم ہو رہی تھی پھر بھی مدھم سی لَو جھلملا رہی تھی۔ قبر کو دیکھ کر سپاہیوں نے اپنے سروں سے ٹوپ اُتار لیے اور چپ چاپ کھڑے دم توڑتی ہوئی موم بتی کو تکنے لگے۔ اُن کے چہروں پر سکون چھا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد بوڑھیا کالی چادر اوڑھے وہاں آ پہنچی۔ سپاہیوں نے اُسے اِس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ آہستہ سے قبر کے پاس جھکی، چادر سے دوسری موم بتی نکالی اور بجھتی ہوئی لَو سے اُسے جلا کر وہاں رکھ دیا اُٹھنے میں اُسے تکلیف ہوئی۔ تو سپاہیوں نے اُسکی مدد کی۔

اُس نے سپاہیوں کو دیکھا جو شان سے ننگے سر قبر کے پاس خاموش کھڑے تھے۔ چادر کو ٹھیک کرتی ہوئی وہ وہاں سے چل دی۔ سپاہیوں نے نگاہوں سے اُس کا تعاقب کیا۔ اس کے بعد وہ درد کی ٹیسیں لیتے پُل کے پار چلے گئے جہاں اُن کے باقی ساتھی لڑ رہے تھے ـــــ اور قبر کے پاس وہ موم بتی جلتی رہی ـــــ اور امر جیوتی کی مانند سدا جلتی رہے گی۔

(یہ افسانہ انگریزی سے مستعار لیا گیا ہے۔ اصل ماخذ کا علم نہیں ہو سکا)

ماہنامہ شعلہ اور شبنم دہلی۔ 1958ء

میرے بچے کی سالگرہ

(منے کی نیلی نیلی آنکھوں کے نام)

آج میرے بچے کی سالگرہ ہے۔

میرے بچے نے آج تیسری بہار میں قدم رکھا ہے۔ بہار.... جو بڑی حسین ہوا کرتی ہے، جس میں پھول اور خوشبو اور حسن اور رنگ اور نور نہ جانے کہاں کہاں سے اُبھر کر دھرتی کے جگر چاک کر کے باہر پھوٹ آتا ہے جیسے یک لخت کوئی چشمہ نیند کی مدہ ماتی گود سے جاگ پڑا ہو۔ بہار اور اس کی کلپنا کتنی موہنی ہوتی ہے ـــــ؟

لیکن آج یہ کیا ہو رہا ہے؟

بہار تو ایسی نہیں ہوا کرتی۔

پھول اور بہار سے کبھی نالاں نہیں رہتے۔ وہ ہمیشہ ہر حال میں بہار کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن ـــ لیکن آج یہ لدکتی روکتی، بہکی بہکی دردناکی،

کیوں اور کہاں سے اُمڈ آئی ہے۔؟

آج سے ڈھائی سال پہلے جب موہنی نے چپکے چپکے لجا کی لال لال کلیوں کو سمیٹتے ہوئے میرے کان میں اپنے ماں بننے کی سرگوشی کی تھی۔ تو روایت اور دستور کے بالکل خلاف مجھ پہ ماتم سا پڑ گیا تھا۔ خوشی کا کوئی بھی شائبہ میرے دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی میرا چہرہ گلنار ہوا تھا۔ ہاں البتہ ایک بات مجھے اب تک بالکل اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ماتھے کی معصوم شکنیں گہری ہو گئی تھیں۔ غم اور تردد فضاؤں سے اُبل کر میرے خوبصورت چہرے پر پھیل گیا تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے آسمانوں کے دریچے کھول کر بڑھاپا آہستہ آہستہ میرے بالوں کی اور بڑھ رہا ہو۔ لیکن پھر میں نے ایک دھیمی سی تبدیلی اپنے وجود میں رچتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اور اچانک ایک دن سکول جاتے جاتے راستے میں خوشی سی اُبھری ہوئی ایک مسکان جانے کیوں میرے خشک ہونٹوں پر پھیلی تھی۔ اور پھر میں نے کلپناؤں کے تاج محل بنانا شروع کیے تھے۔

میرا بچہ !

میرا ننھا ! !

کیسا ہو گا وہ ؟

کس قدر عظیم، کس قدر حسین۔ تمکنت اور وقار اور رنگ سے بھرپور۔ جیسے دیوالی کا ایک چمکتا ہوا دیپ، جیسے گیہوں کے وسیع کھیت میں کھلا ہوا بے حد سرخ لالے کا پھول!

دل نے مجھے جھولا دیا۔ موہنی اُسے نزاکت دے گی۔ بہاروں کی چھلکتی ہوئی مدھو سے اُس کا مُنہ دُھلائے گی۔ اُسے حُسن دے گی اور میں......

اُس میں اپنی ساری شاعری اور انسانیت کا رس ٹپکا دوں گا۔ سنجیدہ خاتون

کا نغمہ بنا دوں گا۔

اور پھر موہنی کا پیٹ پھولتا گیا۔ ایک اِنچ ــــ دو اِنچ ــــ چار ــــ اور میرے کلپناؤں کے ماتیل میں اتھل پتھل ہوتی رہی۔ میرے ذہن کی آنکھیں اُسے شاعر دیکھتی رہیں۔ وہ محنت کشوں کا پرچم اُٹھائے گلی گلی پھرتا رہا۔ میں نے اُسے کسی بڑی مجلس میں کہانی سُناتے دیکھا۔

میرا کرشن چندر

میرا فیوچک

اور پھر وہ دن بڑی تیزی سے بڑھتا چلا آیا۔ ایک نئی تخلیق وجود میں آئی۔ جیسے ذہن کے نہاں خانوں میں ایک کہانی ڈھل کر کاغذ پر ٹپک پڑی ہو۔ جیسے صبح مسکرائی ہو یا پھر جیسے آنچار کے دودھ جیسے پانیوں میں یک لخت بہت سارے کنول کھل اُٹھے ہوں۔

بچہ پیدا ہوا!

بھگوان ابھی انسان سے نراش نہیں تھا!!

اور ٹھاکوی ٹیگور مسکرا رہا تھا!!!

بچہ! ــــ میں نے ادھ کھلی پلکوں میں ساری محبت بھر کر دیکھا۔ جیسے میری پہلی کہانیوں کے مجموعے کا پہلا ایڈیشن چھپ چکا ہو۔

ایک کلرک، ایک ماسٹر، ایک کھردرے ہاتھوں والا مزدور پیدا ہوا تھا۔

ناؔدم، چکبست، نراؔلا اور ندیم قاسمی آسمانوں سے اُتر آیا تھا۔

میری ادھ کھلی، محبت بھری پلکوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ چوری چھپے ماں کی عدم موجودگی میں کسی سے کہنے سُننے بغیر، بے آواز مختلف زاویوں سے موہنی میری نگاہوں کا تعاقب کرتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر پیار سی مسکراہٹ

پھیلتی رہی۔

بچہ کافی حسین تھا!

موہنی نے اُسے حُسن اور نزاکت دی تھی اور میں نے اُسے کیا کیا دیا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عزم کی تصویر جھلک رہی تھی۔ اور مجھے اُس کی اُن نیلی نیلی ـــــ بلیوں والی آنکھوں سے عشق ہو گیا۔ نیلی نیلی آنکھیں ـــــ نیلی نیلی جھیلیں، جیسے مانسبل اور کوثر ناگ کی نیلاہٹوں کو اِن آنکھوں میں بند کر دیا گیا ہو

بچہ بڑھتا گیا۔

اور پھر ایک مسئلہ پیدا ہوا بچے کو کیا کہا جائے۔ کیسے پُکارا جائے۔ کس نام سے محبت کی رمق چھڑک دی جائے۔ دماغ نے ساتھ نہ دیا۔ تو ہم لوگوں نے سوچا کہ اُسے صرف مُنا کہا جائے۔ تو پھر بچہ بچے سے یک لخت پھاند کر مُنا بن گیا۔ مُنا دل کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہوا آبشار ـــــ

مُنے نے دھیمے دھیمے ہاتھ پاؤں ہلانا شروع کئے۔ اور پھر ایک دن وہ رینگنے لگا۔ جیسے کوئی بچھڑا اپنی ماں کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ پھُدک رہا ہو۔ قلابازیاں کھا رہا ہو۔ گر رہا ہو اور رو رو کر یک لخت ہنس رہا ہو۔

اُس کی مُنی مُنی آنکھیں کبھی اچانک مسکرا دیتیں۔ کچھ کہنے کو بڑھتیں، پھر رک جاتیں اور پھر مُسکرا دیتیں۔ جیسے رات اندھیارے میں دیا جلے یا دور کسی بانسری کی لے فضاؤں میں ڈولتی ہوئی سماعتوں کا طواف کرے۔ یار دوست آئے۔ اُنہوں نے نئی کہانی کو دیکھا۔ بھر پور نظر ڈالی۔ ہنس دیئے اُسے ہنسایا۔ اُس کی نیلی نیلی جھیلوں کو دیکھا۔ چوما ـــــ اُس کے خالص چینی کٹ چہرے کا بغور تجزیہ کیا۔ اُس کی ناک کو چھو چھو کر دیکھا اور فتوے صادر کیا ـــــ

"یہ ماؤ! خوش نصیب ہو ماؤ نے تمہارے ہاں جنم لیا ہے"۔

اور میں سوچنے لگا۔

کلپنا ـــــ بچہ ـــــ منا ـــــ ماؤ

بارتقاؤ کا عجیب و غریب عمل

منے نے ایک دن ایکا ایک قدم اٹھایا اور چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک قدم دو قدم ـــــ تین ـــــ اڑا اڑا دھم ـــــ سر کے بل گرا۔ خون کے فوارے پھوٹ بہے۔ لیکن پھر دوسرے منوں کی طرح اس نے بھی قدم سنبھال لیا۔ منا اب دو برس کا ہو گیا ہے۔

یوں سمجھ لیجئے۔ ایک پینٹنگ ہے۔ جسے دو برس سے میں رنگ کرتا رہا ہوں ان دو سالوں میں میں نے اپنے خونِ جگر سے اس کی رنگ آمیزی کی ہے۔ اور مجھے ہر بار اقبال کا ایک شعر یاد آتا رہا ہے۔ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اور منا بنتا رہا ہے، بگڑتا رہا ہے

ہنستا رہا ہے، روتا رہا ہے

آج منے کی سالگرہ ہے۔ تصویر دو سال کی مکمل ہو گئی ہے۔ میں اپنی اس حسین نیلی آنکھوں والی تصویر کو خود ہی بدھائی دے رہا ہوں۔ کیوں کہ مجھے علم ہے کہ یہ تصویر ایک اس کلاکار نے جنم دی ہے۔ جو اپنا خونِ جگر دے کر کام کرنا جانتا ہے۔ لیکن جسے زمانے نے ہر قدم پر ہر محاذ پر شکست دی ہے۔ دنیا نے اوچھے ہتھیار استعمال کر کے اس کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اس کی تصویر اور اس کی غمناک کہانی سراہنے والا کوئی نہیں۔ اس لئے آج کے عظیم دن پر اپنی تصویر اور اپنی کہانی کو خود ہی خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔ کیا ہوا۔ جو اس کی تصویر پیرس یا نیویارک کی آرٹ گیلری کی زینت نہ بن سکی، کیا ہوا جو

اُس کی کہانی لمبے چوڑے نام والے رسالوں میں چھپ نہ سکی۔ اور اُس کا نام تک بھی کوئی جان نہ سکا۔ وہ تصویروں میں رنگ بھرتا رہے گا۔ حسین اور زندگی کے نور سے بھرے ہوئے رنگ ——

اور جب نیا انسان پیدا ہوگا وہ جُھک کر اُسے سلام کریگا۔ کہانی کار اور کلاکار کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر اس کی ان اُنگلیوں کو چومے گا جن کی حرکتوں نے اس تصویر اور اس کہانی کو زندگی بخشی۔ تب کلاکار کی باری ہوگی اور جوانی اور حُسن اور زندگی خود اس سے لپٹ جائیگی اور بڑھاپا مر جائے گا اور کلاکار کا چہرہ پھر سے گلنار ہوگا۔

(۲)

اس کہانی میں ایک زبردست خلا باقی رہا ہے جس کا پورا ہونا شاید ہی کبھی ممکن ہو۔ مُنّا ایک سال سے بھوکا ہے۔ اُس سے دودھ چھینا گیا ہے۔ جس میں زہریلے جراثیم ڈال دیئے گئے ہیں۔ اور اگر وہ یہ دودھ پی لیتا ہے تو اُس کی زندگی کا دایرہ تنگ ہوتا جائے گا۔

اور یہ تصویر اور یہ کہانی نزع کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔ اور مجھے یہ منظور نہیں۔ کہانی کار جو ہوں! کہانی۔ کہانی کار کی روح ہوتی ہے اور روح کو آج تک کس نے موت کا جام پلایا ہے۔

مُنّے کی ماں ایک سال سے بیمار ہے۔ مُنّا اس کو پہچانتا ہے اُسے معلوم ہے کہ اُس کا ابا پریشان ہے۔ اُس کی نیندیں زخمی ہیں۔ اُس کے ارادوں کے ستون لڑکھڑا رہے ہیں۔ وہ ایک ایک کوڑی کا محتاج ہے۔

مُنّا بڑا ذہین ہے ان سب باتوں کو اچھی طرح جان رہا ہے۔ خفیف نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اور میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے جہاں نمی ہے۔ ارادوں کی راکھ اور تمناؤں کی سسکیاں ہیں۔ مُنّے کی نیلی نیلی آنکھوں

میں شعلے جیسے اُبھر رہے ہیں۔ اور میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ مجھے تمام کائنات گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اور میں اُس کے ساتھ آنکھ مِلانے کی تاب نہیں رکھتا۔

طوفان تھم رہا ہے

میں پھر نظریں پھیر رہا ہوں۔ نیلی نیلی آنکھیں ڈبکیاں لگا لگا کر مجھ سے بھیک مانگ رہی ہیں ــــــ

"کُم بھی مُشکلاؤ اَبا! ہمارے بھی دن آ رہے ہیں!"

روزنامہ "مارتنڈ" شورانتری نمبر

سرینگر ــ اپریل ۱۹۵۷ء

سپنوں کی شام

یہ ندی جس کے کنارے آپ اِس وقت کھڑے ہیں اور دور دور تک اُن ہریالے کھیتوں کا تبسم دیکھ رہے ہیں اور اُفق کی پھیلی ہوئی آغوش پر نیلی نیلی برف پوش پہاڑیوں کو تک رہے ہیں، جو آسمان کی نیلاہٹوں سے مِل کر گم ہو رہی ہیں، ظاہر ہے ایک ننھی سی بل کھاتی ہوئی لہراتی ہوئی ندی ہے۔ جس کے کنارے کوئی لاابالی شاعر چنار کے گھنے درخت سے ٹیک لگائے شعر سوچنا پسند کرتا ہے۔ یہ صرف ایک ندی ہی نہیں کچھ اور بھی ہے مجھے معلوم ہے کہ آپ اُس بنفشی جھنڈ کی طرف دیکھ رہے ہیں، یہاں یاسمن کی جھاڑیاں جھوم رہی ہیں۔ اور جہاں پر نظر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے اور نگاہیں گھنٹوں کچھ کھوجنے لگتی ہیں اور جہاں کچھ سائے ڈھلک رہے ہیں۔ اور یوں لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی دیہاتن سماوار سر پر رکھے اپنے محبوب کے لئے چائے لے رہی ہو۔

میں بھی حساس آدمی ہوں صاحب۔ میں بھی اس حُسن کو محسوس

کر سکتا ہوں۔ میرا دل بھی ایسی شاعرانہ چیزیں دیکھ کر گنگنانے لگتا ہے لیکن۔

جس روز میں نے ساجی کو دیکھا تھا۔ وہ اماوس کی ایک تاریک رات تھی۔ ہم سب ایک بڑے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے میں ایک کہانی سُنا رہا تھا اور ساجی مکئی کے بھٹے بھون رہی تھی۔ الاؤ کا پرتو اُس کے چہرے پر پڑ کر اُسے لازوال حُسن بخش رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ بڑی نفاست سے بھٹے بھون رہے تھے کبھی کبھی جب میں کہانی کے کسی عجیب و غریب موڑ پر رُک جاتا تو وہ بھی رُک جاتی۔ اُس کے بازوؤں میں پڑے ہوئے کڑے بھی رُک جاتے اور مکئی کا اَدھ بھنا بھٹا بھی رُک جاتا۔ پھر جھکی جھکی نیم وا نگاہیں دھیمے سے اُٹھ کر میرے وجود کو ٹٹولتیں۔ اور مجھے یہ محسوس ہوتا جیسے کہکشاں نے آسمان کی بلندیوں سے اُتر کر مجھے ایک لمحے کے لئے تاکا ہو۔ اور پھر جب میں سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر اپنی داستان جاری رکھتا تو ہاتھ پھر صفائی سے کام کرنے لگتے۔ بانہوں میں پڑے ہوئے چاندی کے دو کڑے پھر بج اُٹھتے اور مکئی کا اَدھ بھنا بھٹا پھر آگ پر چٹخنے کی آواز پیدا کرتا۔ اور ساجی کے چہرے پر الاؤ کے پرتو سے پھر لازوال حسن کی لالی کِھل جاتی۔

دوسرے دن جب میں باہر کھیتوں میں جا رہا تھا تو دھان کوٹتے ہوئے ساجی نوری سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ کون ہے ری؟"

"یہاں کیسے آ گیا؟"

"عجیب باتیں کرتا ہے"

اور جب انھوں نے میری آہٹ سُنی تو دونوں چونک پڑی تھیں۔ ایک لمحے تک دونوں ہی مجھے دیکھتی رہی اور پھر جب وہ لمحہ بیت گیا۔ تو میں نے نظر

پھیر کر دیکھ لیا۔ نوری نے بے باک ہنسی کا جھرنا بہا دیا۔ اور معنی خیز نظروں سے ساجی کے چہرے پر سے کچھ کریدنے لگی۔ اور ساجی نے حیا کے سارے رنگ اپنے چہرے پر لال کر دیئے اور مجھے یوں لگا جیسے چناروں کی سب سرخیاں آنگن کے اس کونے میں اوکھلی کے گرد جمع ہو گئی ہوں۔

ساجی کون تھی ؟

کیا تھی ؟

کہاں رہتی تھی ؟

مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ رمضان جو کے سالے کی بیٹی ہے رمضان جو اس مکان کا ملک تھا۔ جہاں میں ان دنوں ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے حال ہی میں اس گاؤں کے سنگل ٹیچر سکول میں اُستاد مقرر کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ گاؤں کافی دور تھا۔ اس لئے میں مہینوں شہر کی گھما گھمی سے دور پڑا رہتا۔ پہلے پہل میں نے سکول میں ہی رہائش اختیار کی تھی۔ لیکن بعد میں رمضان جو کے بچوں کو گھر پر پڑھانے کا کام ملا تھا۔ اور میں اُن کے یہاں ہی اُٹھ آیا تھا۔

اُس دن بارشیں زوروں سے ہوئی تھیں۔ گاؤں کی تمام سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہو گئی تھیں۔ اور اس مٹی سے اٹی ہوئی پہاڑی سے پانی بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ شام کو مدرسہ بند کرنے کے بعد واپس گھر آ رہا تھا تو میں نے دیکھا تھا اس بڑی سی کریوہ سے ایک عورت سر پر ایک بڑا سا ٹوکرا رکھے سنبھل سنبھل کر ڈگ بھرتی نیچے سڑک کی طرف آ رہی ہے۔ اس کا ہر قدم بڑی صفائی اور احتیاط سے کریوہ کی نشیب کی طرف پڑ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی کریوہ کی گیلی سطح پر اُس کا پاؤں پھسل پھسل جاتا تھا۔

اور ایسا لگتا تھا کہ بس اب گری۔ لیکن وہ بڑی احتیاط سے خوف اور خطرہ سے بے نیاز بڑھی آ رہی تھی۔ اب سڑک تک بہت کم فاصلہ تھا۔ دس قدم اور تو وہ صحیح وسلامت سڑک پر آ جاتی دفعتاً اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ چاروں شانے چت کریوہ کی ڈھلوان پر پھسلتی لڑکھڑاتی گر پڑی۔ کریوہ کی اوپر والی کھوہ ہلنے لگی۔ اور اس سے پہلے کہ دھماکہ ہو۔ یہ کھوہ منوں مٹی لے کر اس دیہاتن سمیت نیچے آ گرے اور اُسے ہمیشہ کی نیند سُلا دے میں پنجوں کے بل دوڑا۔ اُسے بازو سے پکڑ کر نیچے گھسیٹ لایا۔ دھماکہ ہوا۔ میرا سر چکرا گیا اور میں بھی سڑک پر گر پڑا۔ ایک لمحے کے بعد جب میں نے اُٹھ کر دیکھا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ کریوہ کی وہ بڑی سی کھوہ جس کے نیچے سے ابھی ابھی میں اُس انجانی عورت کو کھینچ لایا تھا۔ بہت نیچے کریوہ سے جدا ہو کر گر پڑی تھی۔ یہ کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا اور میرے سامنے ایک خوبصورت لڑکی کیچڑ میں لت پت پڑی ہوئی تھی اور اب اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سا ـــ سا ـــ جی! غیر ارادی طور میرے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور میں حیرت سے بُت بنا رہا اسے تکتا رہا۔

آپ ـــ ما ـــ سٹر ـــ صاحب!" وہ بھی حیرانی سے نظریں جھکائے بولی۔ اور دوسرے لمحے میں نے سہارا دیکر اُسے اُٹھنے میں مدد دی۔

زور دار بارشوں میں اس طرح اپنی جان پر کھیل جانا۔ اِتنی بھی کیا مجبوری تھی۔؟ میں نے پھر پوچھا۔

"مٹی کے ڈھیلے لانے گئی تھی۔ آج تو ـــ میں ـــ مرتے مرتے ـــ بچ ـــ" وہ رُک رُک بولتی گئی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور پکی ہوئی خوبانیوں نے اپنا تمام رنگ اُس کے گالوں میں بھر دیا تھا۔ لیکن پھر جانے اُس کے دل میں کیا خیال آیا۔ اُس نے ایک بھرپور نظر اپنے سارے وجود پہ ڈال دی۔ اور جیسے ہوا

شرمیلی نگاہ سے مجھے بھی دیکھا۔ اور پھر وہ بے تحاشہ بھاگ گئی۔

ساجی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔

رمضان جو کے بچے اور پاس پڑوس کے چند بچے روز میرے پاس آتے۔ میں انہیں پڑھایا کرتا یا کبھی تصویریں دکھا دکھا کر بہلاتا، کبھی کبھی تصویریں دیکھنے کے بہانے ساجی اور نوری بھی آتی۔ ساجی خاموش رہتی۔ لیکن نوری سوالوں کی بوچھاڑ کرتی۔

"آپ کی شادی ہوئی ہے؟

"کب ہوگی"؟

"کس سے شادی کریں گے آپ"۔

"آپ کا شہر کیسا ہے"؟

"آپ حقہ کیوں نہیں پیتے"؟

"کیا آپ نے کھل لبوز" کا مزہ چکھا ہے"؟

"کیا آپ سفیدے پر چڑھ سکتے ہیں"؟

"مکئی کے بھٹے آپ کو کیوں پسند ہیں"؟

"کیا آپ —— ؟"

ساجی صرف چٹائی پر نظریں جمائے رہتی، ایک لفظ بھی کہے بغیر جیسے قدرت نے اُس کے یاقوتی ہونٹوں پر خاموشی کا بوسہ ثبت کر دیا ہو۔ کبھی کبھار اُس کی پلکوں کے غلاف اوپر اُٹھتے اور اُس کی سیاہ اور نم آنکھیں میگھ دوت کا پیغام سناتی اور اُس کے سارے وجود میں جل ترنگ کا ساز بجنے اُٹھتا۔ نوری اور ساجی دونوں میں نہ ہوتے ہوئے بھی ایک نمایاں فرق تھا۔ نوری، ایک نغمہ تھی۔ تو ساجی فیض کی ایک نامکمل غزل، نوری سورج طلوع ہونے کا سماں تھی تو ساجی چاندنی رات میں ندی کی نرمل لہروں سے کھیلتی ہوئی چاندنی رات

میں ندی کی نرمل لہروں سے کھیلتی ہوئی چاند کی چنچل کرنیں۔ نوری محبت کی رنگینی تھی
تو ساجی محبوب کے ہونٹوں کا پہلا بوسہ! نوری اور ساجی ——!

نوری ساجی کی بڑی پیاری سہیلی تھی۔ دونوں ایک ہی عمر کی تھی۔ نوری بے باک تھی۔
بمبر زل جو شبنم کی چند چھینٹیں پڑنے سے بہک گیا ہو۔ اِس سے بات کرتے کرتے
میں ہمیشہ نغموں کی مسحور کرنے والی لَے میں بھٹک جاتا لیکن جو بات ساجی میں تھی
وہ نوری میں کہاں ؟

ساجی جب بھی سامنے آتی تو مجھے یوں لگتا جیسے میں کسی پُرسکون وادی میں ایک
نیلی سی جھیل کے کنارے ناشپاتی کے گھنے درخت کی چھاؤں میں لیٹا ہوا ہوں۔

اور پھر دن بیت چلے۔ نوری کی شادی ہوئی اور روتے روتے کاجل کی گہری
لکیروں کو زخمی کرتے ہوئے چلی گئی۔ شادی سے چند روز پہلے کسی کام سے وہ ہمارے
ہاں چلی آئی۔ اور میں نے اُسے دیکھا حیرت انگیز تبدیلی آئی ہوئی تھی اس میں سنجیدگی اور
متانت نے بے باکی کی جگہ لے لی تھی۔ جب وہ ہنستی تو پہلا سا ساز نہیں بجتا ایک
دھیمی دھیمی راگنی پھوٹ پڑتی —— اس کے جانے سے میرے دل کو دھکا سا ضرور لگا
اور چند لمحے بے خیال ہو چیتے سوچتے اس کی نذر کئی کرے۔ لیکن اس کے بغیر مجھے
اپنی زندگی اکیلی بھی محسوس نہ ہوئی ایک تلاطم سا نہیں اُٹھا۔

ساجی نے اب ہمارے ہاں آنا بالکل کم کر دیا تھا۔ نوری کے جانے کے بعد
مجھے اسکی آنکھوں میں حسرتیں سی کھنڈتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اگر کبھی کبھار آ بھی جاتی
تو معمولی سی گفتگو کے بعد چلی جاتی۔ صرف جاتے جاتے مُڑ مُڑ کے دیکھتی۔ اُس کی
آنکھیں پھیکی سی مسکراہٹ پھیلاتیں۔ اور پھر وہ چلی جاتی۔ جیسے فضاؤں میں
ڈولتا ہوا جنگ کا نغمہ سوتے سوتے سو گیا ہو۔

ایک دن رمضان جو نے مجھ سے اچانک کہا کہ میلے کپڑے پہن کر ان کے ساتھ
چاولوں اور وہ سب ساجی کے ہاں جا رہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ——

کل ساجی کی شادی ہے۔

ساجی کی شادی! مجھے سناٹا آیا۔ میں اس کے چہرے کو کریدتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں! ماسٹر جی! ساجی بیٹی کی شادی ہے۔ آپ چلئے گا ضرور، آپ کو بھی انہوں نے بلایا ہے۔ میں نے بہانہ بنا کر بوڑھے رمضان جو کو رخصت کیا۔

ساجی کی شادی —— ساجی کی شادی —— جیسے فضاؤں میں صرف یہی آواز ڈول رہی ہو۔ جیسے چنار کے سرخ پتے عجیب سی سرسراہٹ پیدا کر کے نیچے گر پڑے ہوں یا جیسے بہار نے کھڑکیوں کے پٹ کھولنے کے بعد اندر آنے سے پہلے قدم واپس پھیر لئے ہوں۔

ساجی نے اس ملگجی شام جب رات کا سناٹا رس آیا تھا۔ جب اس کے گھر میں عورتیں اس کے لئے گیت گا رہی تھیں۔ اور جب دوسرے گاؤں سے اس کا شہزادہ جیسا دولہا گھوڑے پر چڑھ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے والا تھا۔ مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ مجھ سے مل بھی نہ سکی کیونکہ وہ ساجی تھی۔ کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی۔ اور ساجیاں شادی کے وقت اپنے عشق کو بھلا ڈالتی ہیں۔ اور وہ اپنے محبوب سے مل بھی نہ سکتیں۔ صرف آہستہ آہستہ کھیت کی منڈھیر پر کسی درخت کی چھاؤں میں چپکے چپکے آنسو بہاتی ہیں جن کو دیکھا نہ جا سکے پہچانا نہ جا سکے۔

اور جب رات مر رہی تھی —— اور صبح کا نور دھیمے دھیمے اس گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں ساجی رہتی تھی —— تو دور سے گم ہوتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ جوان نو خیز اور البیلی جوانیوں کے گیتوں کی آواز۔

اور پھر رات کی تاریکی میں ڈولتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ ؏

ع۔ وُنیئس نام دڈپ نقم ژیر گوم ژیر گوم
نبر وو لی ژیر پوشن چھاوانی

ترجمہ:- اب تک تُو تُو کہہ رہی تھی کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔ اب خوبانیوں کے پھول لوٹتے چلی جا۔ میری لاڈلی۔

ساجی ڈولی میں بیٹھی ایک نئے گھر جا رہی تھی۔ اُس کے دل پر کیا بیت رہی تھی کون جانے؟ لیکن پھر نیم تاریکی میں ڈولتی ہوئی ایک آواز اُبھرتی تھی۔ وہ ہیے کو چیتاونی دیتی ہوئی دھیمی آواز سے

ع:- یارِ چھے نیندر نہ وُنہ وُڑ ناوی زیں
طوطہ بول پوشن کرناوی زیں

ترجمہ۔ "ہماری ننھی سی چڑیا سو رہی ہے۔ اے طوطے میاں اسے رستے میں جگا کر بولیاں کروانا۔"

اور ساجی خوبانیوں کے پھول اڑاتی چلی گئی۔ اسی طرح آہستہ آہستہ جس طرح لوری چلی گئی تھی۔ جس طرح جانے کتنی ہماری ساجیاں اور لڈویاں چلی جاتی ہیں وہ سب جوانی کے کسی ان پوچھے لمحے میں کھو کر پیار کرتی ہیں وہ بھی دوسروں کی طرح گلاب کی جھاڑیوں، مکئی کے کھیتوں اور ناشپاتیوں کے درختوں کے جھنڈ میں پورے چاند کی راتوں میں محبت نام کی کسی چیز کو محسوس کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ اکٹھے رہنے کے معصوم وعدے کر لیتی ہیں۔ لیکن پھر شادی کے بعد ایسے چلی جاتی ہیں۔ جیسے اُنہوں نے محبوب کے چہرے پر اپنے لمبے لمبے بال کھولے ہی نہ ہوں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور اپنے نئے گھر جا کر وہ اپنے تمام ارمانوں اور آرزوؤں کے زخموں کو اپنے شوہروں کے قدموں پر دھر دیتی ہیں اور عشق و محبت، خلوص اور میٹھی میٹھی کسک سب کچھ خاوند کے وجود میں جذب ہو جاتا۔

اس بار موسم بہت اچھا رہا تھا۔ اُمید کے بالکل خلاف فصل بھی بڑی پُر امید تھی۔ حد نظر تک دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کسان بڑے شاداں اور مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ بہت سالوں کے بعد اس بار فصل اتنی اچھی ہوئی تھی۔ سال بھر انہوں نے اپنا خون جگر دھان کے پودے کو پلایا تھا۔ جب ہی تو وہ پودے آج جوانی کی اُمنگوں سے سرشار جھوم رہے تھے۔ بعض جگہوں پر فصلیں کاٹی جانے والی تھیں۔ ان دِنوں ادم پورہ کی زندگی پر شباب کا رنگ نکھر آیا تھا۔ کھیت اور کھلیان گیتوں اور نغموں سے گونج رہے تھے۔ دھان کے لانبے لانبے پودے کٹ کر کھیتوں میں انگڑائیاں لے رہے تھے۔ درانتیاں چمک رہی تھیں۔ اور کھیتوں کے کنارے چناروں کی لمبی قطاروں کے نیچے سے عورتوں کے کارواں گزرتے جن کے سروں پر سفید بھاپ اڑاتے ہوئے سماوار رکھے ہوتے۔ جن میں اُن کے شوہروں اور بیٹیوں کے لئے گرم چائے کی چسکیاں ہوتیں۔

دو چار دنوں سے آسمان ابر سے ڈھکا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بادلوں کے کارواں کسی خطرناک مہم پر جا رہے ہیں۔ بارشوں کے خوف نے گاؤں کے لوگوں میں زیادہ حرکت پیدا کر دی تھی۔ ساجی اپنے خاوند سلا آما کے ساتھ کام کرتی۔ اس بار فصل کے ساتھ اُس نے بڑی اُمیدیں وابستہ کر دی تھیں۔ اُس کے تین چھوٹے ننھے پھرن آئیں گے۔ پاؤں میں اچھا سا چپل آئے گا چھوٹی سی بکری آئے گی۔ مگر پھر بارشیں۔ بارش پہلے پہل دھیمی برسنے لگی۔ لیکن پھر بارشوں نے اپنے تمام داؤ لڑائے۔ اور سارا گاؤں بے حس ہو گیا۔ ادم پورہ میں بہنے والی اس چھوٹی سی ندی میں پانی چڑھنے لگا۔ اور پھر وہ منحوس گھڑی

آن پہنچی جب تور کا بند ٹوٹ گیا اور وہ سب پانی اس ندی میں بہہ گیا۔ اور یہ ننھی سی ندی اِک سمندر بن گئی۔ فصلیں تباہ ہوئیں اور اوم پورہ موت کی گود میں سونے لگا۔

بارشیں رکنے کے چند دن بعد گاؤں کے باہر بڑے میدان میں ڈھول زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ گاؤں پھر حرکت میں آنے لگا۔ دھرتی کے ان مظلوم بیٹوں کے چہروں سے غم ٹپک رہا تھا۔ لیکن اِن کے ارادوں میں آگ بھری ہوئی تھی۔ وہ خونخوار لگ رہے تھے۔ اور اسی حالت میں "کولہ وان" کرنے جا رہے تھے یہ سب لوگ اس ندی کا زہر بند کرنے جا رہے تھے۔ جو آہستہ آہستہ اُن کے کھیتوں اور اُن کی فصلوں میں داخل ہو رہا تھا۔

جب یہ کاروان ندی کے اُس کنارے جا رہا تھا جہاں ندی اپنا خونخوار مُنہ کھولے موت کا راگ الاپ رہی تھی۔ تو لوگوں کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ اُن کے ہونٹوں میں ارادوں کی آگ تھی۔ اور اُن کے لبوں پر عزائم کی مضبوطیوں کے گیت تھے ـــــ کارواں کچھ آگے جا چکا تھا

میں نے دیکھا ـــــ ایک عورت ہوش و حواس کھو کے اندھا دھند بڑھی آ رہی ہے۔ میری چیخ نکل گئی۔

یہ ـــــ ساجی تھی

ساجی! میں نے اُسے روکا۔

تو کہاں جا رہی ہے ساجی۔

وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئی۔ ایک بھرپور نظر میرے سارے وجود پر پھینک دی۔

"سلاما" "کولہ وان" پر گیا ہے تیز بارشوں میں پھسل کر مکان سے گر پڑا اُس کا سارا جسم دکھ رہا ہے۔ وہ کام نہیں کر سکتا۔ میں خود ندی کا رُخ

موڑ دوں گی!" مجھے سناٹا آگیا ـــــ

ساجی ـــــ ایک نازک حسین لڑکی ملکی کا ادھ بھنا بھٹا آج خلوص اور ہمدردی محبت اور فرض کا طوفان بن کر سامنے آگئی تھی. وہ آج صرف ساجی نہ تھی، شوہر کے لئے ایک ڈھال تھی. صدیوں کا سناٹا اور صدیوں کا لاوا آج پھوٹ پڑا تھا۔

"ساجی تم وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مر جاؤ گی" اُس نے مجھ پر ایک زہر آلود نظر ڈالی۔ پلکوں کے باریک درزیچوں میں چھپنے والی آنکھیں زہر بھی اگل سکتی ہیں۔ یہ آج مجھے معلوم ہوا تھا۔

"ماسٹر جی! آپ یہ کیا سبق دے رہے ہیں۔ سلاما کو لے وان پر مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے اور میں عورت بنی اُس کا انتظار کرتی رہوں۔ یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا!

یہ ساجی کا دوسرا روپ تھا۔!

اور وہ فضا میں ایک عجیب سرسراہٹ چھوڑ کر چلی گئی۔

دوسرے دن تمام گاؤں اُس میدان میں جمع ہوا تھا۔ لوگ کولہ وان سے واپس آگئے تھے ندی کو شانت کیا گیا تھا۔ لیکن آج خوشی کے گیت نہیں گائے جا رہے تھے۔ آج ڈھول نہیں پیٹا جا رہا تھا۔ آج ناچ نہیں ہو رہا تھا لوگوں کی آنکھیں جھکی جھکی تھیں۔ ناشپاتیوں کا رس سوکھ گیا تھا۔ چناروں کے سر نگوں تھے۔ ساجی کو جاتے جاتے ندی نے ہڑپ کر لیا تھا۔ پچھلے دن اُس نے زور کے بند پر حیرت انگیز بہادری اور ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے برابر مردوں کے ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن شام گئے۔ اُس کا پاؤں اچانک پھسل گیا تھا۔ اور وہ طوفانی لہروں میں کھو گئی تھی۔ اور لوگ دھاڑیں مار مار کر چیختے تھے ـــــ

یہ ندی جس کے کنارے آپ اس وقت کھڑے ہیں، اور دور دور تک ان ہریالے کھیتوں کا تبسم دیکھ رہے ہیں۔ اور افق کی پھیلی ہوئی آغوش پر نیلی نیلی برف پوش پہاڑوں کو تک رہے ہیں، جو آسمان کی نیلاہٹوں سے مل کر گم ہو رہی ہیں۔ جس کے کنارے ہر ایک لاابالی شاعر

چنار کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر شعر سوچنا پسند کرتا ہے — او میپورہ میں رہنے والی ایک حسین لڑکی کا مزار ہے۔ جس نے اخروٹوں اور ہاشپاتیوں اور درختوں کی چھاؤں میں ایک چاندنی رات مجھ سے عہد و پیمان کیے تھے اور جس کے گھنیرے بالوں میں منہ چھپا کر میں نے ایک انجانی زندگی کا خواب دیکھا تھا اور جو میری یادوں کے اُفق پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔

—— "ماہنامہ بیسویں صدی" دہلی

۱۹۵۷ء

ہنسی کی موت

(اپنی جوان مرگ بہن کے نام)

چاند آسمان پر سُلگ رہا تھا اس نے چاند کی زرد پیلی کرنوں میں اُس کی لاش کو دیکھا۔ لاش بالکل اِس روشنی کے مانند پیلی پڑ چکی تھی۔ سرد اور زرد برف ایسی سرد، اِس پر ایک جمود چھا چکا تھا۔ صبح تک یہی جسم ایک حسین کلی تھی۔ ایک مُسکراتا نازار۔ لیکن اُف اب..... چند گھنٹوں کے بعد یہ جسم لاش تھا۔ صرف ایک زرد لاش۔

یہ چند مختصر گھنٹے اہم تھے۔ زندگی اور موت جیون اور رات... جمود اور حرکت.... چند گھنٹے پہلے ـــ اس جسم سے ہنسی کے فوارے پھوٹے اور اب اس میں سے ایک پُراسرار اور المناک خاموشی..... ایک ماتمی سناٹا رستا تھا۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ لاش اُس کی بہن کی تھی۔ جو اُسے بہت پیاری تھی۔ کاش وہ یہ سب دیکھ ہی نہ سکتا۔ اُس نے رونا چاہا۔ لیکن وہ رو بھی نہ سکا۔ اُس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ڈھلکا۔ حالانکہ اُسے رونے کی ضرورت شدت سے محسوس

ہوئی۔ اُس نے چاروں اور نظر دوڑائی۔ تارے اُداس تھے۔ فضا پر ماتم چھا چکا تھا۔ اور چاند آسمان پر سُلگ رہا تھا۔ کاش! یہ آسمان ٹوٹ گرتا...... کاش آگ لگ جاتی۔ اِس تاروں بھری دُنیا کو...... لیکن اس کی "کاش" تڑپ کے ہی رہ گئی۔ اُس نے آخری بار اپنی بہن کو اس وقت دیکھا تھا۔ جب وہ گاؤں میں تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اُس کے پاس چلا گیا تھا تو وہ بڑے تپاک سے ملی تھی۔ وہ اپنے پتی کے ساتھ شہر کے اِس دم گھٹنے اور جاگیردارانہ ماحول سے دُور بھاگ گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اِس قدر دُور چلی جائے کہ اِس دنیا اور یہاں کے بسنے والے "انسان" کی نظروں کا سایہ اُس پر نہ پڑے۔ اُسے آج کل کے اِنسان سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ اِس سماج.... اِس ململی لبادہ میں لپٹی ہوئی دنیا سے بہت خائف ہو چکی تھی۔

وہ ایک پڑھی لکھی اور بہت ذہین عورت تھی۔ اُس کے خیالات ترقی پسندانہ اور آدرش بہت بلند تھے۔ اس کی مانگ ایک غریب نوجوان نے بھر دی تھی، جو اِس سماج اور نظام کا پیدا شکار تھا۔ وہ ڈگری پاس کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی حکومت کے دفاتر میں اُسے اَن فِٹ بنایا گیا۔

روز روز کی ناکامیوں نے یاس کی پرچھائیاں اِس میں سموئی تھیں۔ وہ اکثر غم گین رہتا۔ اُسے چاروں اور نا اُمیدی کے بغیر کچھ بھی دِکھائی نہ دیتا۔ جب کبھی کوئی اس کی پیاری بیوی کی اور تیکھی نظروں سے دیکھتا۔ تو اُسے ایسا لگتا۔ گویا کوئی آبشار بہت بلندی سے اُس پر آن گرا ہو۔ وہ اُس ماحول سے دُور بہت دُور جانا چاہتا۔ اور موت کی تمنا کرتا۔ لیکن بیوی نے اُس کے جمود کو پاش پاش کیا۔ اُس نے اُسے زندہ رہنے کی تحریک دی۔

"زندہ رہو۔ اور مقابلہ کرو"۔ وہ اُسے للکارتی...... "زندگی سے فرار ہماری موت ہے۔ وہ غریبی کے احساس پر ایک طنز ہے۔ اور طنز میں کبھی برداشت نہیں کرتی"۔

بعض اوقات وہ بہت جوش میں تڑپتی ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی آنکھوں سے انگارے برستے ۔ اور اس کی زبان سے زہر اُگلتا۔ میں اُس دن پھر یہاں آؤں گی۔ جب ہمارے سماج میں انقلاب آئیگا۔ جب انسانیت، یکسانیت اور بھائی چارے کی پرانی ریت بن کر آئے گی۔ جب انسان بدل جائیگا۔ میں نہیں چاہتی کہ سماج کے یہ گِدھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرمایہ دالانہ نظام کے یہ بچھو مجھے ڈنک ماریں ۔ ۔ ۔ ۔

میری عزت خطرے میں ہے۔ میرے پتی کا وفا دار سسک رہا ہے۔ غریب اور پست طبقے پر یہ "برلا" مار کر انسان کلہاڑیاں لئے جھپٹ رہے ہیں۔ وہ اُن کے پسینے سے بہے ہوئے خون کی ایک ایک بوند کو منجمد کر کے ایک ایک روپیہ لیتے ہیں۔ میری عزت اور آبرو پر یہ لمبی توندیں ۔ ۔ ۔ ۔ مذہب کے ٹھیکہ دار "پنڈت صاحب" اور "رائے بہادر" للکار رہے ہیں ۔ ۔ ۔ بُزدل کمینے ۔ کُتے ۔ ۔ ۔ میں نِکے کو مرنے نہیں دوں گی۔ میں ماں ہوں۔ میں بیٹی ہوں۔ میں میکسم گورکی کی "ماں" ہوں۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔

اُسے بھگوان سے شکایت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بھگوان کی ذات سے منکر ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے ایک کھوکھلا سا محسوس ہوتا۔ بھگوان ہے کہاں! وہ کہتی ۔ اگر وہ ہوتا تو انسان کبھی اس قدر شیطان نہ ہوتا۔ دنیا میں کبھی بھی بھوک نہ ہوتی۔ بڑی بڑی توندیں چپکے ہوئے پیٹوں پر اپنا سایہ نہ ڈالتیں۔ تب معصوم انسانوں کی کھوپڑیوں کی مالا نہ بنائی جاتی۔ عصمتیں سرِ بازار نہ بکتیں۔ عورتوں کی چھاتیوں اور شرمناک جگہوں پر مذہبی نعرے نہ کھدوائے جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بابو قتل نہ ہوتا۔ غریبوں کی پھڑ پھڑاتی لاشوں پر امارت کے محل کھڑے نہ ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ بھگوان ۔ بھگوان ۔ ۔ ۔ ۔ تو کہاں ہے؟ تو ہے بھی ہے نہیں۔

اگر تو ہے ۔ تو دنیا میں ایک اندولن کیوں نہیں آتا۔ نالش کیوں نہیں

ہوتا۔ ایسی دنیا کا بھگوان!۔۔۔ لیکن بھگوان بھی تو خود غرض ہے۔ اسی سرمایہ دار کا پٹھو۔ جب تک دودھ اور قند سے نہلایا نہ جائے۔ بس روٹھا ہی رہتا ہے۔ لیکن کاش وہ اس بات کا احساس کرتا کہ اس دودھ کی نہر میں معصوم انسان کے خون کی سوندھی سوندھی بو ہے۔ اس میں "پسینے" کی کراہ ہے۔ بھگوان غریب دل کے بے لوث پیار کا پانی قبول کیوں نہیں کرتا۔ گو اس نے اپنے خاوند کو جینے کی تحریک دی تھی۔ لیکن پھر وہ بھی بے چارہ دھیرے دھیرے سِل کی وادیوں میں اُتر رہا تھا۔ وہ اب خون اُگلنے لگا تھا۔ پان کی پیک کی بجائے وہ خون کی پیک تھوکتا اس کا پھیپھڑا کراہ اُٹھتا۔ اور یاس اُسے لپیٹ جاتی۔

انتہائی کوشش کے بعد اُسے ایک دکان میں ایک کلرک کی جگہ ملی تھی۔ دن بھر وہ لکھتا رہتا۔ اس کی گردن جھکی رہتی اور قلم فائیلوں پر پھیلتی رہتی۔ اُس کی کمر کے خم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور وہ خون تھوکتا رہا۔ پھیپھڑا ایچنتا رہا۔ لیکن اُن کی زندگی تلخ ہونیکے باوجود وہ خوش تھے۔ وہ زندگی کی گاڑی کو خراماں لئے جا رہے تھے۔ بہت زیادہ محسوس کرنے سے وہ بے چاری بھی دل میں گھٹن محسوس کرنے لگی تھی۔ اُس کے دل میں غمناک دھڑکنیں دھڑکتیں۔ لیکن خوش حال مستقبل کے خیال سے وہ چہک سی اُٹھتی۔

اور ۔۔۔ اِس سال جب وہ اپنی بہن کے پاس گرمیاں گزارنے گیا۔ جھیل کے کناروں پر یہ دن اچھی طرح کٹے تھے۔ گو یہ دن نہایت غریبد تھے۔ اب اس کی یاد ۔۔۔ یاد بن گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر جلتا رہا۔ خون بہاتا رہا ..... جلتا رہا۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد جب وہ واپس آیا۔ تو کتنی عاجزی اور پیار اور جدائی کا احساس اُس کی بہن کی آنکھوں میں لہراتا رہا تھا۔ جب وہ دیہات کی پگڈنڈی کو عبور کر رہا تھا۔ تو وہ اُسے دیہاتی مکان کی کھڑکی سے تکتی رہی۔

اس کے نین چھلک رہے تھے۔ "بھیا گھر پہنچتے ہی خط لکھ دینا۔ یہ اُس کی آواز تھی۔ اور وہ پھر ہنسی تھی۔ جیسے ساز بج اُٹھا ہو۔ اب وہ ہنسی اُس سے چھن چکی تھی۔ چشموں کا ترنم سو چکا تھا۔ مسکراہٹ موت کے ظالم ہاتھوں نے چھین لی تھی۔ اور یہ ہنسی، دور چتا میں کراہ رہی تھی۔ مرنے سے ایک دن پہلے اُسے بہن کا خط ملا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"بھیا بہت دنوں کے بعد لکھ رہی ہوں۔ تمہارے جیجا جی کی صحت خراب تھی۔ اب ٹھیک ہو رہے ہیں۔ زندگی اسی محور پر ہے۔ لیکن زندگی کو کہتے ہیں۔ زندگی کے ساتھ جد و جہد ہی حیات ہے۔ ماں کو تسلی دینا"۔

کاش وہ جانتی کہ یہ آخری تسلی ہے۔ جو وہ بیوہ ماں کو دے رہی ہے۔ یہ آخری خط ہے جس کی قسمیں کھائی جائیں گی۔ کاش وہ سمجھ پاتی کہ آج ماں کو تسلی دینے والی بیٹی کے بچے کو کل "ماں" ہی تسلی دینا ہو گی۔ اُف! مرنے والے کس قدر بیدرد ہوتے ہیں ــــ

پچھلی رات اُسے دل میں بہت گھٹن محسوس ہوئی تھی۔ اور صبح ہوتے ہی اپنے پتی کے قدموں میں اُس نے جان دیدی تھی۔ ہارٹ فیل نے اُسے اتنی بھی فرصت نہ دی تھی۔ کہ وہ اپنے بچے کو تسلی دیتی۔ اُسے پیار کرتی۔ اس کے پتی نے لاش کو گاڑی میں لایا تھا ــــ

اور آج ... جب وہ گھر آیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ ماسٹر "ٹیوشن" نے اسکی اعصابی قوت چھین لی تھی۔ گھر پر ماتم چھا چکا تھا۔ دبی دبی سسکیاں بھگوان کی اور بڑھ رہی تھیں۔ ایک لاش ... ہنسی کی لاش۔ اپنی مری ہوئی انقلابی آنکھوں سے بھگوان کی ایک اور شرارت پر ہنس رہی تھی۔ وہ سن سے رہ گیا یہ اُس کی بہن تھی۔ ماضی کا دھندلکا اُسکی نگاہوں میں تھا۔ اُس نے دیکھا۔ ماں

چلا چلا کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اِس کے دل میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ناچ ناچ رہی تھیں۔ اور ایک معصوم بچہ، "ماں دودھ" کہتا لاش کی اور بڑھ رہا تھا ...... فضا وحشت ناک تھی۔

آسمان جل رہا تھا! ــــــــــــ اور دُور اُفق کونے پہ چاند سُلگ رہا تھا ہولے ہولے۔

روزنامہ "جیوتی" سرینگر
دسمبر ۱۹۵۲ء

اُجڑی بہاروں کے اُجڑے پھول

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی

سانجھوں کی عجیب عجیب باتوں نے دل و دماغ کو سوچوں کی گہرائیوں میں چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد رُکی رُکی نگاہیں ستیش کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ جو اِس وقت تک خاموش، کلپناؤں کے طوفان میں سویا پڑا تھا۔ سگریٹ جل کر ختم ہو رہا تھا۔ اور اس کی انگلیوں سے پیار کرنے لگا تھا۔

اور ——— جلتے سگریٹ نے اُس کی انگلیوں کو پوری طرح چوم لیا خاموشی کا نار زخمی ہوا۔ اُس کی بجھی بجھی آنکھوں میں ایک داستان ہلورے لینے لگی۔

آپ بھی کچھ کہیئے ———"

"میں"! جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔

کہ "کہیئے" گا سُن کر.... جیسے وہ کراہ اُٹھا ——— اور اُس کے اندر کے

زخم جیسے رسنے لگے۔ مگر پھر مجبور ہو کر کچھ کہنے کے موڈ میں آ ہی گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر ایک اور سگریٹ سُلگایا ایک لمبا کش کھینچا اور کہنے لگا رحیم یہ اُن دِنوں کا واقعہ ہے جب میں کان پور میں رہا کرتا تھا ــــ آج سے تقریباً سات سال پہلے ملک کا بٹوارہ ہوا تھا ــــ اور ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر پشاور سے کان پور چلے آئے تھے ــــ ہم نے سب کچھ کھو دیا۔ بٹوارے کی حالت اور اُس کے بعد کے واقعات ہم نے خود دیکھے تھے۔ ــــ اُس کا احساس کرتے ہی دماغ میں لاشوں کی بستی بس جاتی ــــ اور چیخ مارنے کو جی کرتا ــــ میں زیادہ فرصت کے لمحوں میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھا کرتا۔

یار دوست آتے، گپیں ہانکی جاتی یا پھر تاش کی ایک آدھ بازی ہوتی۔

گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ آسمان بادلوں سے گھِرا ہوا تھا ــــ سورج بادلوں کے سفید سمندر میں ڈوب گیا تھا ــــ آثار بتا رہے تھے کہ بارش خوب ہوگی ــــ ہم چند ساتھی کمرے میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ــــ کمرے میں گہری خاموشی تھی ــــ صرف تاش کی بازی ختم ہونے پر یا تاش پھینٹتے پھینٹتے ہماری آپسی باتیں اِس پیاری خاموشی کو جھنجھوڑ دیتی۔

باہر کچھ شور ہوا۔

ہم کھیلتے رہے

شور بڑھتا گیا ــــ ہم خاموش کھیلتے رہے لیکن پھر مکان کے نیچے بیٹھے ہوئے پنواڑی کی آواز نے چونکا دیا۔

"ستیش صاحب! ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔

ستیش صاحب"!

آواز اونچی تھی مذاق کا پہلو غالب تھا۔

جی ! " میں چلایا — کیا ہے —؟

" ذرا دیکھئے تو —؟

" میں نے کھڑکی کھول دی "

" ساڑھیاں خریدیں گے — بنسی کی شریر ہنسی نے سواگت کیا "

" ساڑھیاں —؟ " میں سوالیہ نشان بن گیا۔

" ہاں ہاں ! ساڑھیاں، رنگین ساڑھیاں " بنسی ہنسی " میں کھو گیا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا — باہر سڑک پر لوگوں کا ایک ریلا بہہ آیا تھا۔

اُس کے کندھے پر ایک شلوار اور ایک ساڑھی تھی —

دونوں چیزیں نئی اور قیمتی دیکھ پڑتی تھیں — میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھا — آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا — اور نیچے رنگین مزاج لڑکے گندی گندی ترکیبیں تراشتے رہتے۔ ہنسی کے فوارے جھوم جھوم کر چھوٹتے رہے

وہ آدمی اس طوفان میں کھو گیا تھا — اُس کی صورت میں گھبراہٹ اور شدید غم کا سنگم تھا۔

" صاحبو " ! وہ تقریباً رو اُٹھا۔

" کیوں دل دُکھاتے ہو — نہ دنیا ہو منت دو مگر اس طرح ..... "

اُس کی آواز میں لکنت تھی — مجھے ایسا لگا — جیسے اُس کی رگ رگ کراہ رہی ہو اور اس کے بدن کا ایک ایک انگ رو رہا ہو۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔

"ٹھہرو ـــ" میں چلایا اور بھاگا بھاگا باہر چلا آیا۔ لوگوں کے سمندر کو پھاندتا دوسرے لمحہ میں اُس کے پاس تھا۔ لوگ اِشاروں میں بول رہے تھے۔

"بھگوان ـــ" وہ اُبل پڑا۔

میں نے دیکھا موت کے پیلے پیلے رنگ اُس کے چہرے پر چھانے لگے تھے۔ اُس کا نحیف جسم لرز رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور آنسوؤں میں دکھوں کی داستان رو رہی تھی۔ میں یہ سب دیکھ نہ سکا۔ اُسے گلے سے لگا کر پاس ہی ایک سٹول پر بٹھا دیا۔ اُس پر غشی طاری ہوئی۔ لوگ ـــ اب اُسے حیرانی سے تکنے لگے تھے ـــ ہنسی کی ہنسی منہ بسور کر پشیمان تھی۔ اور فقرے کہنے والے دوست خاموش تھے۔ میں نے اُسے پانی کا ایک گلاس پلا دیا۔ اور پھر اُس سے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھ لی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ مجھے گھورتا رہا۔ آنسوؤں کی لمبی دھار دل کی گہرائیوں سے پھوٹ کر اُس کے میلے میلے کپڑوں میں جذب ہو گئی۔

"میری بولی بولی نوچ لو ـــ بابو"۔ میں دُکھی ہو کر بہت دُکھی۔

ـــ یہ شلوار ساڑھی لو ـــ مجھے کفن دو ....."

اُس کا گلا سوکھ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر پھوٹ آئیں۔ جیسے اُسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو ـــ

شلوار، ساڑھی، کفن۔ کوئی زور زور سے میرے دماغ پر ہتھوڑے برساتا رہا۔

"کہاں رہتے ہو" ـــ؟

"وہاں ــــ" وہ آنکھوں سے سمجھانے لگا۔ میں اُس کا بازو پکڑے چلنے لگا ــــ لوگوں کا ایک دریا پیچھے پیچھے بہتا آیا۔

تقریباً آدھ میل چلنے کے بعد ہم ایک گندی سی گلی میں آئے۔ اُس نے ایک گرے ہوئے دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا ــــ یہی اُس کا مکان تھا۔

قدم اندر دھرتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ اور میں گرتے گرتے بچا۔ سامنے ایک لاش تھی!

ایک عورت کی لاش ــــ جس نے کچھ پہلے ہی ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ ایک بچہ خون میں لتھڑا ہوا پاس ہی سویا پڑا تھا۔ جاگنے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے سو گیا تھا۔

ایک عورت ــــ ایک بچہ ــــ دو لاشیں۔ بھگوان کا ایک انوکھا کھیل!

پاس ہی ایک مریل سا کتا لاش کو سونگھ رہا تھا۔

عورت بے حد حسین تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکان پھیلی ہوئی تھی ــــ لیکن پھیلتے پھیلتے ہی موت نے اُس کی ابدیت چھیننے کی ناکام کوشش کی تھی ــــ وہ شاید اس لئے مسکرائی تھی ــــ کہ آخر اُس نے ننھے مہمان کو بھی دیکھ لیا تھا۔ جس کا انتظار کرتے کرتے اُس کی آنکھیں پک گئی تھیں۔ جس کے تصور ہی نے اس کی کلپناؤں کو سجایا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ بچے کے گال پر تھا۔

شاید اسے پیار کر رہا تھا ــــ شاید اُس کا ہاتھ بھی ــــ اُس کی پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بچے کو لوری سنانے کے لئے بے قرار تھا۔

اور بچہ بھگوان کی عظیم ترین تخلیق دنیا کی سب سے بڑی سچائی ـــــ جس کے بارے میں مہاکوی ٹیگور نے کہا تھا ـــــ

"جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ پیام لے آتا ہے۔ کہ بھگوان ابھی انسان سے نراش نہیں ـــــ" سو گیا تھا۔ شاید اُس نے ماں کے بغیر رہنے سے بغاوت کی تھی۔ یا پھر گورو دیو کا دعوےٰ جھٹلا کر بھگوان انسان سے نراش تھا۔ ہم سب یہ دیکھ کر کانپ اُٹھے۔ سب خاموش تھے۔ دلوں میں طوفان گرجنے لگا تھا۔ ہونٹوں پر فریادیں بے تاب تھیں۔ میں اپنے پُر کوشش کے باوجود قابو نہ پا سکا۔ اور آنکھوں میں اس قدر نمی محسوس ہوئی، جیسے خود میری ماں مر گئی ہو۔

شنکر (بعد میں معلوم ہوا۔ اُس آدمی کا نام ہے) ایک پرائیویٹ فرم میں چپراسی تھا۔ وہ دراصل کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لیکن پیٹ کے ہاتھوں تنگ آکر وہاں سے چلا آیا تھا۔ اور یہاں بڑی آوارہ گردی کے بعد اس فرم میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب حالت کچھ سنبھلی تو ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا۔ اور سسرال سے اپنی بیوی کو بھی لیتا آیا ـــــ

آج ڈیڑھ سال سے وہ یہاں رہ رہا تھا۔ اس کی تنخواہ بالکل کم تھی۔ اور مشکل سے ہی گزر ہوتی۔ لیکن پھر بھی وہ مسرور تھا۔ اپنی حسین بیوی کو پاکر جیسے اُسے کائینات مِل گئی تھی۔ وہ اپنے فاقوں اور اپنے دُکھوں کو بھول جاتا۔

وہ ـــــ اس کی حسین بیوی بھی خود بڑی محنت کرتی اور زندگی کی گاڑی ہچکولے کھا کھا جاتی رہی۔ ایک دوسرے کو پاکر اُنہیں کبھی بھی کم خوراک یا زیادہ محنت کی شکایت نہ رہی۔ شام کو جب وہ ملتے۔ دُکھوں کی دُنیا دُور کھو جاتی۔ پیار اور خلوص اپنا آنچل

پھیلا دیتا ـــــ وہ اُس آنچل تلے ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ـــ

ایک حسین و رنگین دنیا کے سپنے اُن کی کلپناؤں میں ناچنے لگتے ـــ

عزم اور ہمت کی چنگاری دہکنے لگتی ۔

اور ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے کی تمنا مچل مچل کر اُن کے دلوں کو گُدگُداتی ۔

ایک دن ـــ گوری نے لجا کر اُسے اپنے ماں بننے کی بات بتادی تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اُس دن سے شنکر کو اپنی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ قیمتی محسوس ہوئی ۔ اور وہ پہلے سے کچھ سنجیدہ بن گیا۔

گوری آنے والے مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئی۔ وہ خود ہی کپڑے سیتی۔ ایک ریشمی سویٹر بنا کر ـــ ایک انڈر شرٹ تیار کیا۔ وہ خود ہی مسکرانے لگتی۔ اُس کے تخیل میں ایک ننھا رینگنے لگتا ـــ اور ہمک ہمک کر کہتا ـــ ڈیڈو، ڈیڈو، ڈیڈی ـــــ امی! اُس کی چیزوں کو نخس نخس کر دیتا۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی اپنی باہیں پھیلا دیتی بلاؤز کے بٹن کھول کر اپنی چھاتی نکال کر کہتی۔

"آجا آجا ـــ آجا میرے راجہ"

"پی لو ـــ پی لو دودھ ـــ تمہاری ماں بلہاری ۔" میرا ننھا ـــــ میرا منا، میرا چاند!"

لیکن پھر اُس کی آنکھیں خود ہی کُھل جاتیں۔ وہ لجا سے لال ہو جاتیں اور اِدھر اُدھر دیکھتی۔ کہیں کسی نے دیکھا نہ ہو۔

اُس دن شنکر نے کہیں ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا پنگوڑا لایا۔ ـــــ وہ رات گئے دیر تک اس کی مرمت کرتے رہے ـــــ اور جب.. پنگوڑا ٹھیک ہوا تو گوری نے اُسے پنگوڑے میں رکھ کر وہ اُسے جُھلانے لگی۔

رسی سے باندھ جھلا دیا ـــــــ بچے کے لئے لائی ہوئی ایک گڑیا کو پنگوڑے میں رکھ کر وہ اُسے جھلانے لگی۔ پنگوڑا کرچ کرچ کر کے جھولتا رہا۔ اور وہ اس کے ساتھ تال ملا ملا کر گاتی رہی۔ جیسے اُس کا مُنا بہت رو اُٹھا ہو۔ اور وہ اُسے لوری سنا سنا کر تھپک رہی ہو۔ اور وہ ایں ایں اوں اوں کر کے تھپکیوں سے مزا لے رہا ہو۔ اور دھیمے دھیمے خوابوں کے شبستانوں کی اور جا رہا ہو۔ شنکر پر اُس دن نشہ چڑھ گیا تھا۔ جیسے پی گیا ہو۔ یا جیسے بھگوان سے حکومت چھین کر خود ہی سورگ کا بادشاہ بن بیٹھا ہو ـــــــ

اُن ہی دنوں کا ذکر ہے کہ فرم کی ایک بڑی دکان جل گئی جس کے ساتھ ہی ملازموں کے ارمان جل گئے۔ اُن کی تنخواہ بند ہوئی۔ اُنہیں چند دنوں بعد تنخواہ دینے کا وعدہ کیا گیا ـــــــ شنکر نے پیٹ کاٹ کر کچھ رقم اُس دن کے لئے بچا رکھی تھی ـــــــ لیکن کوئی صورت نہ پا کر وہ سب رقم پیٹ کی نذر ہوئی۔ اُسے اُمید تھی کہ چند دنوں کے بعد تنخواہ ملے گی ـــــــ لیکن دو ماہ گزرنے پر بھی مالک خاموش تھے ـــــــ ملازموں کی فریادوں کے بعد کچھ پیسے اُنہیں دے دیئے گئے ـــــــ یہ رقم اُن کا پیٹ تک بھرنے کے لئے بھی ناکافی تھی۔ ناکافی خوراک ـــــــ زیادہ محنت اور مالی پریشانی ـــــــ یہ سب چیزیں گوری پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ ـــــــ وہ دن دن گھلتی رہی۔ اُٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوئی ـــــــ آخر شنکر نے ایک دوست کی لڑ سے ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ اُس نے تسلی دیدی ـــــــ دوائیاں اور انجکشن دینے کو کہا۔ شنکر بڑی مصیبت اور پریشانی میں گرفتار ہوا ـــــــ اُس نے فرم کے چند ملازموں سے کچھ روپیہ مانگ کر اور گھر کی بعض چیزوں کو بیچ کر دوا دارو میں لگا دیا ـــــــ گوری نے پھر زندگی کی ڈگر

پر قدم دھر دیا ـــــ لیکن سنبھل کر پھر بھی بہت کچھ کھو دیا
گوری خاوند کو ٹوکتی، لیکن وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہتا
"تم اچھی ہو جاؤ گی گوری رانی ـــــ پھر سب کچھ آ جائے گا۔ اور وہ دن پھر سے قریب کھسک آیا۔

گوری کی صحت پھر خراب ہونے لگی ـــــ اُس کا جی متلانے لگتا۔ ـــــ طبیعت میں بے چینی چھا گئی۔ پیٹ میں شدید درد کا احساس ہوتا.. .... جیسے آرے سے اُس کا پیٹ چیرا جا رہا ہو ـــــ وہ اُسے کہیں بھی جانے نہ دیتی ـــــ اُسے یوں لگتا جیسے اُس کے جانے کے بعد وہ مر جائیگی۔

ناتھ ـــــ ! کہاں جاؤ گے ـــــ میں مر جاؤں گی!

"پگلی! تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا! وہ اُس کے گالوں پر بے شمار بوسوں کی مٹھاس چھڑک دیتا۔

اور پھر وہ دفتر بھی نہ جا سکا ـــــ ہفتہ بھر وہ گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھ سکا۔

اُس دن درد کی شدت سے وہ صبح سے ہی تڑپ رہی تھی ـــــ اوی میں مری! وہ درد کی شدت سے چیخنے لگتی ـــــ شنکر یہ سب کچھ دیکھ نہ سکا۔ اُس کی روح کی جڑیں ہل گئیں اُس نے سوچا کسی دایہ کو لیتا آئے ـــــ گوری سے جلد آنے کا وعدہ کر کے وہ چل دیا جیبیں ٹٹولیں تو ایک بھدا سا سکہ اُس کی ہتھیلی سے چمٹ گیا۔ دوکانداروں سے منت کی لیکن اُنہوں نے پچھلا حساب چکانے کی ڈانٹ پلا دی۔ دفتر کا رُخ کیا۔ بابوؤں سے منت سماجت کی۔ مالک کے سامنے گڑگڑایا۔ لیکن کسی نے بھی اُس کی نہ سُنی۔ اُسے تنخواہ کے باقی ماندہ پیسے بھی نہ مل سکے۔ جیسے سب بہرے اور اندھے ہو گئے تھے۔ ایک زرد چہرے والے نے اُسے وہاں سے نکال

دیا، جس نے اُس کی جگہ لی تھی ــــ وہ پاگل سا ہو گیا۔ دُکھ کی بھاری سلیں اُس کے دماغ پر گر گر اُسے پاش پاش کر گئیں۔ وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ سوچیں زخمی تھیں .... وہ کول تار کی سڑک پر پاگل کُتّے کی طرح دوڑتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ گوری کی چیخیں اُس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ ایک دایہ کے گھر پہنچا۔ لیکن اُس نے بغیر فیس کے آنا منظور نہ کیا۔ اُس نے بھگوان کا واسطہ دیا.... لیکن بھگوان بھی تو آج خاموش تھا گوری کی آواز اُس کے ذہن میں بجتی رہی۔ اُس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگے۔ وہ پھر بھاگتا رہا۔ گھر پہنچا تو وہ جان دے رہی تھی۔ زندگی کا دیپ بجھ رہا تھا ــــ موت کا فولادی ہاتھ گوری کی گردن کو دبوچ رہا تھا ــــ ایک نیم مردہ بچہ خون میں لتھڑا پاس ہی دبی دبی سسکیوں میں کچھ کھوج رہا تھا۔

گوری جان دیتے ہوئے بھی مسکرا کر بچے کو پیار کرنے لگی ــــ شنکر کو دیکھ کر اُس کی آواز بھر اگئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے مالک دیکھا میرا ننھا، پھول سا منا بالکل تمہارے....

وہ پھر کچھ بھی کہہ نہ سکی ــــ پیار کرنے والی تتلی اُڑ چلی تھی ــــ وہ بچے کو پھول کہنے والا پھول خود سوکھ کر اُجڑ چکا تھا ــــ

اُس کے بعد ہی اُس کا ننھا.... پھول سا ننھا بڑے پھول کی تلاش میں بھاگ چکا تھا۔

شنکر کے دماغ کا توازن ڈانوا ڈول تھا۔ اُس کا پنگوڑا زخمی تھا اُس کی گڑیا کا جنازہ نکلا تھا۔ اُس کی کلپناؤں کا محل مسمار ہو چکا تھا۔ اُس کے دونوں پھول ــــ بڑا پھول اور چھوٹا پھول اُجڑ گئے تھے۔

اب کفن خریدنے کے لئے بھی اُس کے پاس پیسہ نہ تھا ــــ صرف گوری کی ایک شلوار اور ایک ساڑھی بچی تھی ــــ وہ ساڑھی جو آج سے تین سال قبل گوری نے شادی کے دن پہن رکھی تھی جس میں سہاگ کی بُو بسی تھی۔ یہی ساڑھی لے کر وہ بازار گیا تھا۔

(۴۳)

کمرے میں طوفان بہہ آیا تھا۔

لوگ خاموش تھے۔ اور خود میں ـــــ میری ماں مرچکی تھی ـــــ میرے سامنے دو پھول تھے۔ زرد زرد پھول ـــــ اُجڑی بہاروں کے اُجڑے پھول ـــــ ہم سب باہر آئے ـــــ سرخ ساڑھی میرے بازوؤں میں تھی۔ میں لوگوں سے اپیل کر رہا تھا ـــــ میری رُندھی ہوئی آواز فضا میں چیخ بن کر دور خلاؤں میں ڈوب جاتی ـــــ بازار ویران ہوگیا تھا ـــــ شنکر نے اپنی آخری پونجی ـــــ سکے ساڑھی میں پھینک دیا اور پھر روپیوں کی بارش ہوئی۔

گوری کا جنازہ دھوم سے نکلا بارش ہونے کے باوجود ہزاروں لوگ جلوس میں شامل تھے۔ ارتھی پھولوں سے اٹی ہوئی تھی ـــــ اُس پھول کی ارتھی جسے جیتے جی کبھی دو وقت کی روٹی نہ ملی تھی ـــــ جسے بھوک نے مغلوب کیا تھا۔ مگر اُس نے بھوک سے ہار نہ مان لی تھی۔ اُس نے مرنا نہیں جینا سیکھا تھا ـــــ لاش اعزاز سے چتا کے سپرد کی گئی۔ شنکر تمام عرصہ گم سُم چتا کا طواف کر رہا تھا اور ہم دہشت سے اُس کی اور دیکھ رہے تھے ـــــ

ستیش ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا

پانی کا ایک گلاس پی کر ـــــ اُس نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

ـــــ اُس کا چہرہ فق ہو گیا تھا ـــــ گلہ صاف کرتے ہوئے وہ بولا۔

اُس کے بعد میں شنکر کو اپنے ہاں لا یا۔ اُس کا دماغ عجیب عجیب سوچیں سوچتا وہ مجھ سے کہتا۔

"ستیش صاحب! کتنے ظالم ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے چند روپیوں

کی خاطر مجھ سے میری زندگی کی دمک چھین لی۔ گوری کبھی نہ مرتی ـــــ ننھا کبھی نہ سوتا ـــــ آہ! جی کرتا ہے آگ لگا دوں اس سنسار کو!"
کبھی کبھی اُس کا جوش دھیما پڑتا ـــــ اور اُس کا لہجہ رازدارانہ ہو جاتا۔
ـــــ مگر پھر بھی ستیش بھیا میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے دونوں سُندر پھولوں کی کہانی کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں ـــــ اپنا جگر کاٹ کر ہر ایک کو دکھانا چاہتا ہوں ـــــ گوری نہیں مر سکتی ـــــ نہیں مر سکتی ـــــ نہیں نہیں ـــــ وہ خوابوں میں بھی گوری کو پکارا کرتا ـــــ

ستیش بھائی! ایک دن اُس نے مجھ سے کہا تم کہانیاں لکھتے ہو نا ـــــ ـــــ ؟ میری اور گوری کی کہانی بھی لکھ دو ـــــ ننھے کی ان میٹھی میٹھی لنگاہوں کی کہانی بھی لکھ دو ـــــ جو جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ کیا کہنا چاہتی تھیں"۔ اُس کی آنکھوں میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اک آگ سی برس رہی تھی۔ اُن آنکھوں سے "لکھ دو گے نا ـــــ ؟" اور میں نے اُس سے لکھنے کا وعدہ کیا۔

لیکن پھر چند ہفتوں کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ بہت تلاش کیا۔ ـــ لیکن کہیں کوئی پتہ نہ ملا۔ تب ایک دوست نے ایک دن کہا شنکر پاگل خانے میں ہے۔ جب وہاں پہنچا تو وہ وہیں تھا۔ عجیب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں دو سفید پھول تھے ـــــ ایک بڑا ایک چھوٹا ـــــ پھول مرجھا گئے تھے۔

"ستیش بھیا! شنکر کے نین چھلک اُٹھے۔ "میں پاگل نہیں ہوں ـــــ اُنہوں نے . . . . اُس کے چہرے سے نور برس رہا تھا۔ سنتری نے اُسے دھکیل کر دوسرے کونے میں بٹھا دیا ـــــ

اُس دن سے میں راتوں کو سو نہ سکا۔ جب سوتا ہوں تو نصف رات کو

عجیب عجیب خواب دیکھا کرتا ہوں۔ دیواروں پر عجیب سائے تھر کتے ہیں۔ جب تصویریں صاف ہوتی ہیں ـــــ تو ایک شلوار ایک ساڑھی اُبھرتی ہے ـــــ ساڑھی کے آنچل میں زرد زرد پھول اجڑے ہوئے زخمی بہاروں کے پھول نظر آتے ہیں ـــــ پھر شنکران مرجھائے ہوئے پھولوں کو چُنتا ہوا دیکھ پڑتا ہے۔ اور میں دہشت سے چیخ مار کر بھاگ اُٹھتا ہوں۔

یہ راز کہے بغیر میں کانپور سے یہاں سرینگر چلا آیا۔ شائد سکون مل سکے۔ مگر یہاں بھی کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے کوئی آواز میرے کان جھنجھوڑ رہی ہو۔

"ستیش! میں پاگل نہیں ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں گوری اور ننھے کی کہانی کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں"۔

"تم میری کہانی لکھ دو ـــــ اُجڑی بہاروں کے اُجڑے پھولوں کی کہانی"۔ ستیش خاموش تھا۔ میرے دل میں زبردست درد انگڑائیاں لے رہا تھا۔ کمرے میں قبرستان کا سناٹا تھا۔ باہر ہوا زور زور سے کراہ رہی تھی۔

۱۷ جنوری ۱۹۵۷ء

بھٹکے نا سور

(۱)

رانی! مجھے تم سے پیار ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کاش! تم اس کو جان سکو۔ تمہاری آنکھوں میں شیش ناگ کی گہرائیاں ہیں، میں جن میں ڈوبنا چاہتا ہوں۔

رانی کا سر پرکاش کے کندھے پر جھک گیا۔ محبت میں پہلے سے زیادہ گرمی آگئی۔

کیوپڈ ور —— اپنے پر پھڑپھڑانے لگا۔ "رانی! —— تم ایک گلاب ہو۔ جو شنالہ مار کی حسین کیاریوں کا پروردہ ہے۔ جس میں ڈل کی رمک ہے میں اس رمک میں کھو جانا چاہتا ہوں۔"

رومان "کلایمکس" پر پہنچ چکا تھا —— دوسرے دن دونوں بھاگ گئے —— رانی اغوا ہو چکی تھی۔ ایک ماہ کے بعد بمبئی کے بازارِ حسن میں ایک گلاب کا اضافہ ہوا تھا۔ جس میں ڈل کی رمک تھی۔ ایک شیش ناگ لہر میں مارہا تھا پرکاش ہنس رہا تھا —— اور کیوپڈ پشیمان تھا۔

(۲)

"ویدجی؟"

"کیا ہے؟"

"میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ آپ نے کل جو دوا دی تھی کچھ . . . ."

"اچھا تو دوا بدلتے ہیں۔ لاؤ دو روپے اور لے جاؤ دوا۔" "یہ لیجیے ___ مگر یہ تو صرف ایک روپیہ بارہ آنے ہی تو ہیں ___ اچھا باقی کل دوں گا۔

"ہوں! ___ جاؤ بڑا آیا کل دینے والا۔"

"مگر ___ مگر ویدجی میرا بچہ بیمار ہے۔ میرا للو سخت بیمار ہے۔ کہیں اس کو کچھ ہو گیا تو . . . . . کل ضرور دوں گا۔ دیوی کی قسم کل ضرور شہر جا کر سارے بھیج دوں گا۔ بھگوان کے لیے میرے بچے للو کی جان بچا لیجیے . . . . . میں اور بھی . . . . .،" جاؤ خبیث۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ___ "ہاں آئیے لالہ جی کیسے آنا ہوا۔ میں تو ابھی وہاں ہی چل رہا تھا ___"

للو کی روح خدا کے پاس چلی گئی۔ ننھا للو وہیں باپ کی گود میں سویا رہا۔ ایک روپیہ بارہ آنے بے حس تھا۔

(۳)

دیپ مالا کی رات تھی!

چراغ جوان تھے ___ مسکرا رہے تھے۔ آنکھیں لڑا رہے تھے! سڑکیں، مکان، دکان ہنس رہے تھے۔ رائے بہادر پنڈت موہن لال بی۔ اے ٹھیکیدار کے ریشمی پردوں والے شبستاں میں لکشمی سمٹ آئی تھی۔ وہاں زندگی وجد میں آکر جھوم رہی تھی۔

ناچ، شراب، جوا، جوبن پر تھا۔ سینکڑوں کے داؤ چل رہے تھے۔ جانی واکر اور سکاچ وسکی گلاسوں میں گا رہی تھی۔ نوٹوں کے پلندے بول رہے تھے۔

زندگی جھوم رہی تھی۔ لکشمی کی پوجا گلاسوں میں لگاتے "امرت" سے ہو رہی تھی۔ اور چراغ جوان تھے۔ اور دیپ مالا کی رات تھی۔

ٹھیکہ دار صاحب کے بچپن کے دوست رام چند کا حجرہ پاس ہی تھا۔ یہ دونوں اکھٹے پڑھنے جاتے۔ اکھٹے اُٹھتے بیٹھتے کھیلتے۔ مگر رام چند گھٹ گھٹ کر "رامو" بن گیا تھا۔ وہ رائے صاحب، ٹھیکہ دار صاحب یا پنڈت صاحب نہ بن سکا۔ وہ رامو تھا۔ ایک بیوی تین بدصورت بچے۔ یک بیوہ بہن اور ایک ٹوٹے سے حجرہ کا رامو۔ جس کا ایک پھیپھڑا بیمار تھا۔ وہ اب ایک مِل میں روزانہ مزدوری پر کام کرتا تھا۔ لیکن بیماری کی وجہ سے بہت مدتوں کے بعد آج مجبور ہو کر کام پر جا چکا تھا۔

وہ سب دو دن کے بھوکے تھے۔ صرف کل کچھ بچائے ہوئے آٹے سے آدھی آدھی روٹی کھائی تھی۔ اور رامو کمزور تھا، بیمار تھا، مِل مزدور تھا۔

"رام کی سیتا" رو رو کر خاموش ہو چکی تھی۔ آنسو سوکھ چکے تھے۔ آنکھوں سے نکلے دیپ کچھ بجھ چکے تھے۔ اُن میں زندگی نہ تھی، تیل نہ تھا۔

بھوک بھوک . . . . . یہاں چراغ بوڑھے ہو کر مر چکے تھے۔

وہاں شبستان میں زندگی تھی!

یہاں جھونپڑی میں موت تھی۔

وہاں اندھیرے کو چیرتی ہوئی روشنی تھی!

یہاں روشنی کو مٹاتی تاریکی تھی!

وہاں ناچ تھا، شراب تھا، جوا تھا!

یہاں۔ یہاں سسکیاں تھیں، زہر تھا۔ سِل کے جراثیم تھے۔

وہاں "کنواری ہنسی" کے جھرنے تھے!

یہاں کفن سے ڈھکی چھپی خاموش مسکان تھی!

وہاں "پنڈت صاحب" کی مخمور آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اور یہاں ــــــ یہاں صبح کے نکلے رامو کو آج بل میں کام نہ ملا تھا۔ دن بھر کسی کام کی تلاش میں اُس کی پلکیں تھکی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں غمناک افسانے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آس کے چراغ بجھ چکے تھے۔

وہاں یاس کا خمار تھا۔

وہاں اور یہاں میں ایک دنیا۔ ایک زمانہ۔ ایک سماج ایک ماحول حائل تھا۔ اور ــــــ اور رات دھیمے دھیمے دردناک انداز میں اونگھ رہی تھی۔ اور چراغ جوان تھے۔ مسکرا رہے تھے۔ آنکھیں لڑا رہے تھے۔

---

۱۵ فروری ۱۹۵۳ء

ننھّی کہانیاں

(۱)

"ٹھہرو!" اور وہ رُک گیا۔

"کہاں جاتے ہو۔ آؤ" سپاہی نے بائیں آنکھ میچ لی۔

"اِدھر ہی ــــ ابھی کچھ مِلا نہیں۔ واپسی پر........"

جواب سپاہی کی کرخت آواز میں معدوم ہوا۔ بوڑھا رکشا بان تھرتھرایا ــــ پسینے نے ہار مان لی۔

"ٹھہر جا حرامی ــــ روشنی کہاں ہے؟"

"لیکن ــ لیکن میں تین دن کا بیمار ہوں۔ ننھا گھر بھوکوں مرا جا رہا ہے ــــ اور........"

"خاموش ــــ"

رات گہری چھا چکی تھی۔ تارے دور آسمان پر ٹمٹما رہے تھے۔ کتّوں کی بے ہنگام بھوں بھوں خاموشی کے تار کو چھیڑ رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف رکشا

اوندھے منہ کراہ رہی تھی۔ رکشا بان حوالات کی گھٹی گھٹی فضا میں خون بہا رہا تھا۔ ایک ٹوٹی جھونپڑی میں ایک ننھا بچہ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ بھوکے کتے سرگوشیوں میں لاش کو نوچ رہے تھے۔ اور "بھوک" دور ـــ خلا میں خدا کی طرف پرواز کر رہی تھی۔

(۲)

"کون ہو؟" ـــ "تمہاری موت"

"میں ـــ لیکن ......"

اور مالک کا بھاری جسم اس کی آنکھوں میں تھا۔

"کہاں ہے فضلی ـــ چھوکری کو کہاں رکھا ہے۔ آج؟"

..... دوسری طرف خاموشی تھی۔ خون کا ابال تھا۔ بھوک کا خوف تھا۔ "بتاؤ ـــ جلد کمینے! کل ہی دو روپیہ بڑھا دوں گا۔ تنخواہ میں......"

دو روپے..... نوکری..... مالک..... بیوی..... عزت..... بھوک... فاقے..... موت۔

فضا ناچتی رہی۔ موت ہنستی رہی۔ انسانیت مرتی رہی۔

"مالک ـــ آقا..... آج آپ زیادہ پی آئے ہیں ـــ ان داتا بھگوان کیلئے ہوش میں آئیے گا۔ میں آپ کا داس ہوں۔" رحیم روتا رہا..... دل دھڑکتا رہا۔ غیرت میں پسینہ آتا رہا۔ سفید بال کراہتے رہے۔

"چپ ـــ بڑا آیا سمجھانے والا۔ بھاگ بدھ کا سالا۔ جلدی کرو۔" مالک کی آنکھیں جلتی رہیں۔ ایک خونی ناچ اس کی آنکھوں میں ناچتا رہا۔ ایک وحشی خمار!

"مالک..... آپ آخر کیا چاہتے ہیں۔ ہوش کی دوا کیجئے۔ آپ آخر کیا سمجھتے ہیں۔ فضلی میری روح ہے۔ اس کی عزت تار تار کر دینا چاہتے ہیں۔

آپ، اِن سفید بالوں میں خون ہے"۔ "اپنا راستہ لیجیے۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "ورنہ

کیا ــــ نمک حرام"۔

پستول حرکت میں آگیا۔ دو گولیاں رحیم کو بوسہ دے گئیں۔ ایک سناٹا مسلط ہوگیا۔ "غیرت" زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ کمرے میں ایک وحشیانہ قہقہہ بلند ہوا "اَن داتا" ــــ دھیمے دھیمے فضلی کی "زندہ لاش" کی اور بڑھ رہا تھا۔

بھگوان سات آسمانوں کو پار کر کے آٹھویں آسمان کی طرف بھاگ رہا تھا۔

روزنامہ جیوتی ۱۹۵۴ء
سرینگر

چلمن کے سایوں میں

ایک جھٹکے سے تانگا رُکا اور وہ بالوں کو سنوارتی ہوئی تانگے سے اُتر پڑی۔ کمپاؤنڈ میں سے تیزی سے گزرتی ہوئی وہ جلد اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کپڑے تبدیل کئے۔ اِسٹیڈی ٹیبل پر ایک لمحہ بیٹھ کر کچھ لکھا... اور زور سے چِلا اُٹھی..... سُلو! او سلو!

سلیم..... ارے موئے کہاں مر گیا آج تُو؟

"آیا بی بی جی!" کہیں دور سے آواز آئی۔

اور وہ ہانپتا کانپتا نزہت باجی کے ڈرائینگ روم کی طرف دوڑا

"جی باجی" وہ دروازے کی چلمن سے جھانکتے ہوئے بولا۔

کہاں مرا تھا، کم بخت اِس وقت تک؟

جی ذرا..... سلیم نے جملہ اُدھورا چھوڑا اور ناخن سے قالین کھُرچنے لگا۔ وہ لجائی اور مسمسی نگاہیں نیچی کئے نزہت کو دیکھنے لگا۔ جواب

ناخنوں کی نیل پالش سے رنگ چکی تھی۔

" دیکھتا کیا ہے۔ یہ خط ڈاک میں ڈال آ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو جلد آنا۔ سائیکل بھی صاف کرنی ہے؟ جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی جا۔"

"اچھا باجی"!

نزہت نے اس کے ہاتھ میں ایک خط تھما دیا۔

اور وہ بھاگا۔ ۔ ۔ ۔

خط سے نکلتی ہوئی بُو اُسے بے چین کرنے لگی۔ خط میں بُو اور بُو میں خط لبسا ہوا تھا۔ وہ بار بار خط ناک کے پاس لے جانے لگا۔ اِسے زور سے سونگھنے لگا۔ وہ ایک ہی سانس میں اس بُو سے ہم کنار ہونا چاہتا تھا۔ اُس کے رس اور مس سے لپٹ جانا چاہتا تھا ـــــــ اور عالم بے اختیاری میں اُس نے نیلے نیلے خط کو چوم لیا۔ ۔ ۔ سینٹ میں لبسا ہوا خط اُس کے ذہن پر چھا گیا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ لیکن کسے پرواہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ دور ایک بُک سٹال پر ایک اینگلوانڈین جوڑا مسکرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا لگا کہ جہاں بھر کی حماقتیں اُس نے کرلی ہیں۔ جبھی یہ سب لوگ ہنس رہے ہیں۔ وہ شرم سے گڑھ گیا۔ سلیم او کم بخت! اُس کے دماغ میں کوئی بول اُٹھا۔ " خط پوسٹ کیا۔؟ نزہت نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

" جی۔ ۔ ۔ ۔ آں۔ ۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی۔

جلد ہی اُس نے حواس جمع کئے۔ ۔ ۔ ۔ ہاں باجی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

" اچھا جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سائیکل صاف کرلے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"جی"

اُس نے سائیکل صاف کرلی۔ وہ بار بار ہینڈل پر ہاتھ پھیرنے

لگا۔ اُسے ٹھیکا.........

"نزہت باجی کے ہاتھ اس کو چھوتے ہیں نا...... آیا وہ سوچنے لگا۔ اُس نے سائیکل کے ایک ایک حصے کو صاف کیا۔

سلیم! ہو گئی تیار سائیکل۔

"آں.... ہینڈل........ ہنہیں.... ہاں"۔

.... ہاں بی بی جی!"

وہ تحت الشعور میں دبے ہوئے جذبات کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"سلیم! وہ نہ جانے کہاں سے چہکی۔

"جی!"

اُس کا دماغ پریشان ہوتا گیا......

"اچھا تو یہاں میاں سلیم نظارۂ قدرت فرما رہے ہیں۔ اور وہاں بیٹھے ہوئے ہم.... انتظار کر رہے ہیں........ اوہ بے ہودہ کہیں کا۔ نزہت نے پورچ میں سے جھانکتے ہوئے سلیم کو گم سم دیکھ۔

"ہاں بی بی جی..... وہ چونک پڑا۔

"خاموش ____ IDIOT"

وہ نیچے اُتری اور اُس کا کان مروڑ لیا ____ ہاتھ کے لمس سے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس پر شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔ کان سرخ ہونے کے باوجود اُسے اس مروڑنے میں کیف سا محسوس ہوا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ نزہت اُس کا کان مروڑتی رہے۔

کم بخت تُو تو فولاد کا بنا ہوا ہے۔ ذرا اوں آں بھی نہیں کرتا۔ نزہت نے سلیم کو چپت مارا۔ ہلکا سا ____ گویا گلاب کا پھول گرا ہو۔ اور ____ اور نزہت وہ نہ بچ سکی۔ اُس کے کنوارے دل میں ایک

لطیف جھرجھری سرایت کر گئی۔ اُس پر مدہوشی سی چھا گئی ـــــ جیسے وہ "پی" گئی ہو ـــــ اور پھر بائیسکل سنبھال کر وہ چل دی۔

سفید ریشمی دوپٹہ دُور لہراتا دکھائی دیا۔ جیسے چاندنی چنار کی پلکوں میں اُلجھ گئی ہو اور سلیم دور تک اُسے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں؟

کام سے فارغ ہو کر سلیم نزہت کے کمرے میں آیا۔ سنگار میز پر چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ لپ سٹک، پاوڈر، ہیر آئیل، لیونڈر اور نہ جانے کیا کیا ملا۔ میز اُلجھی پڑی تھی۔ وہاں خوشبوؤں کا محل تھا۔ سلیم اپنے کو اس میں تحلیل کرنے لگا۔ وہ تکتا رہا۔ یکبارگی اُس کے ہاتھ کانپ اُٹھے۔ اُس نے ہیر آئیل کی بوتل کھولی، اُسے سونگھا۔ کسی فوری جذبے کے تحت وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے کپڑے نکال لیئے۔ اور وہ نہانے لگا ـــــ کپڑے تبدیل کیے اور پھر نزہت کے کمرے میں آیا۔ کریم اور پوڈر سے مُنہ لیپ لیا۔ سینٹ کے چند چھینٹے اِدھر اُدھر پھینک دیئے۔ اور بالوں کو ترتیب دیا۔ اور جب اُس کی نظر فوراً آئینے پر پڑی تو وہ حیران ہو اُٹھا۔ اُس کی صورت سرے سے ہی بدل گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک نیا نکھار نظر سا آنے لگا۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ اُس نے وہاں خوشبوؤں کی مسکراہٹیں پائی۔ وہ بہت خوش ہوا ـــــ چیزوں کو وہ اُلٹنے لگا۔ معاً اُسے خیال آیا کہ اُسے کوئی دیکھ رہا ہے ـــــ مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ نظریں ہٹاتے ہی اُس کی نگاہیں ایک فوٹو پر ٹھٹھک گئیں۔ فوٹو اُسے اپنی طرف کھینچتا گیا۔ یہ نزہت کا پورٹریٹ تھا۔ سلیم اپنے آپ کو بھول گیا۔ اُن خوشبوؤں کو بھول گیا اور ـــــ پھر تصویر، اُس کے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی۔ وہ تصویر تھامے مسہری پر لیٹ گیا۔

تو نزہت طرح طرح کے پوزوں میں آکر اُسے ستانے لگی۔ اُسے اپنے گالوں پر انگور کے سرخ سرخ گچھوں کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ دیا تو اُسے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ وہاں نزہت کا ہاتھ تھا وہاں نیل پالش اور خوشبوؤں کا لطیف احساس تھا۔ وہ جھوم اُٹھا۔

"نزو باجی ——" وہ غیر شعوری طور بڑبڑایا۔

اُس کے ہونٹ فوٹو پورٹریٹ سے لگ چکے تھے۔ وہ شراب پی رہا تھا۔ اپنے جسم میں مستی انڈیل رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جھرنے گنگنا رہے تھے۔
"سلیم ——!" ایک باریک آواز فضا میں بہہ اُٹھی جیسے کوئی ناؤ کنارے جارہی ہو۔ "سلیم چونکا۔ دروازے پر نزہت گھٹنوں کا سہارا لئے دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت وہ کتنی بھلی لگ رہی تھی۔ نزہت کا پورٹریٹ سلیم کے ہاتھ سے چھوٹا وہ بوکھلا سا گیا۔

"باجی —— معاف ....

"کوئی بات نہیں"۔ آواز میں بے پناہ لوچ تھا۔

"لیکن ——؟

کیا دیکھ رہے تھے —— نزہت، سلیم کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اُس کے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے منہ پر مسکراہٹ ناچی۔

"ہاں تو کیا دیکھ رہے تھے تم .... بدتمیز!" نزہت کمرے میں داخل ہوتے شوخی سے بولی۔

"بولو ——"

"جی ..... آ ..... پ ..... فوٹو ...."

"کس کا فوٹو ——؟" وہ ہرنی جیسی آنکھوں کو نچاتی ہوئی بولی۔

"آپ ــــــ کا"

کیوں دیکھ رہے تھے؟ کسی کی تصویر ــــ بدتمیز!"

"بولتے کیوں نہیں۔ کیا دیکھ رہے تھے وہاں ــــ؟" وہ اُسے جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

"آپ کو ــــ!"

"کیوں؟"

"مجھے یہ فوٹو بھلی لگی ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

اُس کی آنکھیں نزہت سے ملیں، جھکیں پھر ملیں۔ نزہت شرما سی گئی اور وہ خود ــــ جیسے اُس پر فسوں شرم انڈیل دی گئی ہو۔

گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر سلیم نزہت کے کمرے میں آیا۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ آہستہ سے اُس نے کمرہ کھول دیا تو ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹھک گیا۔ نزہت عریاں حالت میں کھڑی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے جسم کے پیچ و خم دیکھ رہی تھی۔ اپنے مختلف زاویوں اور قوسوں کو دیکھ کر وہ بے خودی کی حالت میں تھی۔ اُسے اپنے جسم کی خوبصورتی کا احساس ہو چکا تھا۔

سلیم رُکا رُکا رہا۔ خون اُس کی رگوں میں جم کر رہ گیا اور نزہت کے عریاں جسم کو ــــ وہ دیکھتا رہا۔ اُسے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اُس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ ایک لمحے کے بعد نزہت کی آنکھیں آئینے میں ہی سلیم سے ملیں۔ وہ تڑپ سی اُٹھی اور سلیم ــــ اُس کے پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ وہ وہاں سے دم سادھے بھاگ گیا۔ اُس کی سانس رک سی گئی تھی اور اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ اُس کا پاؤں پھسل گیا ــــ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی اور اس کی ٹانگ کو فریکچر ہوا۔ "میں کہاں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

وہ اپنے کو ایک چارپائی پر پڑے محسوس کرکے بولا۔ اُس کے سر اور رانوں

میں پٹیاں بندھی تھیں۔

"تم گھر میں ہو سلیم!" نزہت کرسی سے اُٹھتے بولی۔

"طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھا ہوں ـــــ سر میں درد محسوس ہو رہا ہے"۔

"آرام کرو"

"مگر میں ـــــ"

"تم اچھا ہو جائے تو سب کچھ بتاؤں گی ـــــ"

سلیم کو اس گھر میں رہتے ہوئے سات سال ہو چکے تھے۔ جب وہ یہاں آیا تھا۔ تو ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ مگر اب اٹھارہ سال کا خوبرو اور صحت مند نوجوان تھا۔ گھر کے اکثر کام کاج وہی کرتا تھا۔ خاص طور پر نزہت باجی کے سارے کام اُسے کرنا پڑتے تھے۔ لیکن اُس کا بچپنا ابھی نہیں گیا تھا۔ وہ گاؤں کا رہنے والا تھا اور شہری آداب سیکھنے کے باوجود گاؤں کی معصومیت اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس عمر کے نوجوانوں میں جو ذہنی ہیجان پایا جاتا ہے۔ اُس سے سلیم بھی آشنا ہو چکا تھا۔ لیکن اظہار کی زبان ابھی اُسے نہیں ملی تھی۔ اور حیا کا پردہ اُس کی آنکھوں پر پڑا تھا۔ شدید طور پر زخمی ہونے کے بعد بیڈ پر لیٹے لیٹے اس نے چند دن کے بعد محسوس کیا کہ گھر کے افراد میں سب سے زیادہ نزہت ہی اُس کا خیال رکھتی ہے۔ اس کے اس طرح لیٹے رہنے سے چند دن کے اندر اندر ہی گھر کے لوگ تنگ آ گئے لیکن نزہت اُن کے منہ لگتی اور اُن سے کہتی۔ آپ کے سینے میں پتھر کا ٹکڑا ہے سلیم کے ماں باپ ہوتے تو اُن کی راتوں کی نیند اُڑ جاتی اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر . . . . . . "

اور سب خاموش ہو جاتے۔

سلیم نے اکثر بار محسوس کیا کہ جب اُس کی آنکھ لگی ہوتی تو کوئی آہستہ سے آکر اُس
کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر لیتا۔ پھر یہ نرم و نازک انگلیاں آہستہ آہستہ اس کے
گالوں پر گزرتی ہوئی اس کے نرم ریشمی مونچھوں کو چھو لیتیں۔ تب اُس کے جسم کے
سارے تار جھنجھنا اُٹھتے۔ اُسے انگڑائی لینے کو جی کرتا۔ وہ آنکھیں کھول کر ان ہاتھوں
کو تھامنا چاہتا اور اُن لمبی دراز زلفوں کی چھاؤں میں کھو جانے کی خواہش کرتا۔
لیکن وہ کبھی اپنی آنکھ نہ کھولتا اور نہ انگڑائی لیتا بلکہ گُم سُم خاموش پڑا رہتا۔

چند دن کے اندر سلیم کو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ باجی کا مزاج بدل گیا ہے
اس کے مالکانہ رویئے میں تبدیلی آچکی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کی زبان سے نہ جانے
کیا کیا کہتی ہے۔ اور اپنے سوالوں کا جواب چاہتی ہے۔ دیہات کی فضاؤں میں
پلے ہوئے معصوم نوجوان نے اب اِن سوالوں کے معنی سمجھ لیے تھے ــــــ
اور یک بیک سلیم نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی ہی دنیا میں بسا جا رہا ہے۔ جہاں
حُسن ہے جوانی ہے، مستی ہے خمار ہے، وہ ہے اور نزہت۔ اُسے لگا
جیسے اُس کے کھُردرے کپڑے آہستہ آہستہ اُس کے جسم پر سے اُترے جا رہے ہیں
اور وہ نفیس و باریک کپڑوں میں ملبوس ہواؤں کے جھولے میں اُڑا جا رہا ہے
ایک دن نزہت نے سلیم کو بُلایا۔

"سلو ایک بات پوچھوں!"

"پوچھو جی! ــــ باجی!"

"تم مجھے باجی نہ کہا کرو"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"نزہت"!

"اچھا"

"بولو ــــ"

"نزہت"

"سنو!"

"جی"

"بولوگے!"

"ہاں!"

"سچ"

تم نے اس دن کہا تھا نا ——— نزہت باجی مجھے آپ کا فوٹو اچھا لگتا ہے"۔

"ہاں ——— وہ شرما سا گیا۔

"پسند ہے نا تمہیں"!

"ہاں ———"

"——— اور میں!"

"———"

"بولو ——— بولتے کیوں نہیں!"

"آں ——— ہا.....ں"

"سچ!"

"سنو!"

"جی"

"تم کتنے اچھے ہو!"

"میں ——— میں اچھا ہوں، با.....جی.....

"دیکھو........

"ہاں"

"سلو!"

"جی!"

"تم نہیں جانتے تم کتنے حسین ہو؟"

"سچ .... ہاں ....

جانتے ہو تم کو دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھو۔ سنتے ہو۔ دھک دھک دل کی، جی کرتا ہے، تمہاری آنکھوں کو دیکھتی رہوں ـــــ اور ـــــ اور ـــــ سلو تم آج سے میری چیزوں کو سنبھال لو۔ گھر کا کام چھوڑ دو۔ سلو، اچھے سلو!"

"اچھا ـــــ"

سلیم کی ٹانگ اب ٹھیک ہو چکی تھی۔ سر کا زخم بھی بھر گیا تھا۔ لیکن نقاہت دُور نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک ہفتے کے لیے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا ـــــ دوپہر کا کھانا سب لوگ کھا چکے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار ہو رہی تھی۔ کھانا کھا کے سلیم کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک اُس نے اپنے بالوں میں ریشمی انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ نزہت اِس پر جُھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ بالوں سے کھیل رہے تھے۔ اُس کا چہرہ تپا ہوا تھا۔ وہ اور جھکی ـــــ پھر اور جھکی اور پھر بے تحاشہ سلیم کے ہونٹوں اور گالوں کو چومنا شروع کیا۔ سلیم دم بخود ہو کے رہ گیا۔ اُس کی آنکھ کھل چکی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اور پھر ـــــ کمرے میں جوانی کا جوار بھاٹا بہہ آیا۔ اور وہ دونوں لڑکھڑا کر صوفے پر گر پڑے۔ لیکن دوسرے لمحے ایک مضبوط ڈنڈا اس کے جسم کو چکنا چور کر رہا تھا۔

"کم بخت نمک حرام، ایک آواز گونج اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں نیلے پیلے تارے گھومنے لگے کمرہ اُسے ناچتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کا دل بیٹھ گیا۔ ...... نیم وا آنکھوں سے اُس نے دیکھا ـــــ اُس کی جان جیسے ہی نکل گئی۔ سامنے بیگم صاحبہ تھیں۔ وہ چلا رہی تھی ـــــ "کم بخت

نمک حرام"۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ یہاں سے اسی وقت دفع ہو جاؤ۔

اس واقعے کو ۳۰ سال ہو چکے ہیں۔ اب اُس کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اس کے بچے جوان ہیں۔ کبھی کبھی تنہائیوں میں اُسے اپنا لڑکپن یاد آتا ہے تو دور کہیں سے "نمک حرام" کی آواز اُسے جھنجھوڑ دیتی ہے۔ اور چلمن کے سایوں میں گزرے ہوئے وہ شب و روز اُس کے من میں اتھل پتھل پیدا کرتے ہیں۔ اُسے چاروں طرف سناٹا سا لگتا ہے اور اُس کے چہرے پر حیا کی لالی دوڑ جاتی ہے۔

---

۳ ستمبر ۱۹۵۳ء

لرزتے آنسو

"تم نے سُنا کچھ ـــــ روس نے دنیا کے سامنے امن کی پیشکش کی ہے۔ وہ جنگ نہیں چاہتا!" وہ مبہوت سُنتا رہا۔

"دراصل اُس میں لڑنے کی ہمت نہیں۔ اُس کے پاس ہتھیار ہی نہیں بھلا امریکہ سے کیا خاک لڑ سکے گا۔ جو دنیا کا سب سے امیر ملک ہے۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"مجھے اختلاف ہے تم سے ـــــ تم غلط ہو۔ روس میں مزدور راج ہے۔ وہاں محنت کشوں کی حکومت ہے۔ روس امن چاہتا ہے۔ کیونکہ مزدور امن چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا۔ کہ دنیا ایک دفعہ پھر ناگاساکی اور ہیروشما بن جائے۔ وہ جاپان کی تباہی نہیں چاہتا وہ معصوم ادھ کھلے بچوں سے دودھ کی بوتیں نہیں چھیننا چاہتا۔ وہ کنواری جوانیوں کی بربادی نہیں چاہتا۔ وہ جمود نہیں ـــــ زندگی چاہتا ہے چلتی پھرتی، ہنستی مسکراتی زندگی! وہ کوریا کی سرزمین کو سرخ ہوتے نہیں

دیکھ سکتا۔ وہ انڈونیشا، ویٹ نام، ایران، یونان، جاپان، ملایا، ہند چینی، ہندوستان اور پاکستان کے غریبوں کی موت نہیں چاہتا۔ وہ دنیا بھر کے محنت کشوں کا مسکراتا ہوا اتحاد چاہتا ہے۔ اُن کی موت نہیں ———

اسی لئے ہاں اسی لئے وہ امن چاہتا ہے۔ اُس نے اسی لئے امن کی پیشکش کی۔ اُس نے اسی لئے ٹرومین، میکارتھر، فورڈ اور راک فیلر کے دل کو موم کر دیا۔ عاجزانہ درخواست کی کہ وہ کل کے ٹالسٹائی، گورکی اور مایئکافسکی کو مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ کہ کمدبا کا دل اور خون نہ بہائیے۔ اور یہ تیز دھڑکن اب اعتدال پر آجائے ...." اور وہ بہت کچھ کہے جا رہا تھا۔

——— اور وہ مبہوت سُنتا رہا۔

"لیکن یہ سب میں ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ یہ ڈھونگ ہے سراسر ——— وہ ہر چیز کو حد سے زیادہ لیتے ہیں۔ اور پھر اُسے "اشتراکیت" میں رنگ لیتے ہیں۔ یہ مجھے قطعی پسند نہیں۔ کم بخت یہ ڈھونگ رچا کر دنیا کو خراب کیا۔ مٹی پلید کر دی سبوں کی۔ اُف! میں تو صاحب یہی کہوں گا کہ ان میں طاقت نہیں۔ کہ امریکہ جیسے ملک سے جنگ کریں جہاں ...."

"خاموش! تم نرے کاٹھ کے اُلو ہو"

——— اور وہ مبہوت سُنتا رہا۔

بحث جوبن پر تھی۔ وہ خیالات کے بہاؤ میں بہہ چلا۔ تصورات اُسے دُور بہت دُور لے چلے۔ اِن دِنوں وہ کِس قدر تذبذب میں تھا۔ پریشانیوں اور تفکرات کی لانبی لانبی چٹانوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اُس کا جی کرتا کہ ایک چیخ مار کر کہیں بھاگ جائے ——— ایک وحشیانہ قہقہہ مار کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جمنا کی گہرائیوں میں کھو جائے

کاش! موت ہی آجائے اس زندگی سے۔ یہ زندگی نہیں زندگی کا مذاق تھا۔

ایک ماہ سے برابر کیمپ کے افسر کے پاؤں پکڑتا آرہا تھا۔ کہ مجھے ایک اچھی جگہ بدل دیا جائے۔ یہاں اُس کے بچوں کی صحت تباہ ہوئی جارہی تھی۔ بیوی دق کا شکار ہوکر آہستہ آہستہ موت کی وسعتوں میں ڈوبی جارہی تھی۔ اُس کے لیے کھُلی ہوا چاہیئے۔ نئی خوشی چاہیئے۔ خوراک چاہیئے لیکن یہاں "تنگ ہوا" تک نہیں ملتی۔ کیمپ میں تین سو آدمی پناہ لیئے ہوئے ہیں ــــ جہاں دقت سے سو سما سکتے ہیں۔ جگہ تعفن اور گندگی کی آماجگاہ ہے۔ ہنسی خوشی معدوم ہے مٹ چکی ہے۔ راکھ ہوئی ہے۔ غریب کی ہنسی، مفلس کی ہنسی ــــ خود اُس کی ذات پر نہیں ہے۔ اور اُسے ایسا لگا۔ کہ دنیا قہقہے مار مار کر اُس پر ہنس رہی ہے۔ خوراک پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں۔ اور پھر ــــ تو اوہ اُس کی بیوی مری جارہی تھی۔ ایک بچہ پچھلے دن مرچکا تھا۔ خود اُس کا پھیپھڑا بھی کراہنے لگا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ دق کا شکار ہورہا تھا۔ اُس نے بھی خون اُگلنا شروع کیا تھا۔ پان کی پیک کی بجائے اُس کا زرد منہ خون کی لکیر بنادیتا۔

اُس نے التجا کی، کہ مجھے دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ لیکن اُس کی آواز خلا میں ڈوب کر ختم ہوجاتی ہمر جاتی ہر دفعہ جواب دینے کی بجائے کھدر پوش افسر اُن کی جوان کنواری بیٹی کی طرف دیکھتے۔ اپنی موٹی آنکھ بھیچ لیتے ــــ وہاں ایک خمار پیدا ہوجاتا۔ ایسا خمار جو آج کل نیتاؤں کی آنکھوں میں عام پایا جاتا ہے۔ ایسا ہی وحشی خمار افسر مہاشئے کی آنکھوں میں پایا۔ وہ جل بھن کر کباب ہوجاتا۔ اُس کے خون میں اُبال آجاتا ــــ جی کرتا سالے کا خون پی لے۔ تب وہ اپنے دق بھرے پھیپھڑے کو ٹٹولتا

تو اُسے کمزور پاتا۔ وہ سوچتا۔ اگر یہاں بھی جواب ملا۔ تو میرا خدا ہی حافظ
اب تک افسر صاحب کو وہ بہت سارے چھوٹے موٹے تحائف پہنچ چکا
تھا۔ جس سے کچھ سہولتیں مل چکی تھیں۔ لیکن اب اِس کام کے لیئے جسے بظاہر
افسر بہاشے "بڑا کام" کہتے۔

تحفہ کہاں سے لائے۔ بڑے کام کے لیے بڑا تحفہ ـــــ ریکھا ایک بڑا
تحفہ ـــــ اُس کی کنواری معصوم بیٹی ریکھا ـــــ وہی افسر بہاشے کی نگاہوں
میں ایک بڑا تحفہ تھی۔ ریکھا ـــ اُف! اُس کی رگ رگ بغاوت پر تلی۔ ریکھا
ابھی ایک ادھ کھلی جوانی تھی۔ بچپن اور جوانی کی سرحدوں کو پار کر رہی تھی۔ وہ
اب بھی اپنی جوانی سے بے خبر۔ وہ سب کچھ کرتی جہاں دوسروں کے لیئے حجاب ہونا
جھجک ہوتی۔ وہ اب بھی شرارتیں کرتی ـــــ وہی ریکھا۔ آج ایک تحفہ تھی ـــ
ایک بڑا تحفہ ـــــ ایک رشوت۔ پسینہ اُس کی رگ رگ سے پھوٹ بہا۔
آج ہندوستان کی کنواری بیٹی رشوت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اُس کی عمر آج
وہی تھی۔ جب جارج ششم نے شہزادی الزبتھ کے جوبن میں داخل ہونے
پر نہ جانے کتنے لاکھ پونڈوں کی مٹھائی بانٹی تھی ـــــ نہ جانے کتنوں کا
ہار سنگار خریدا تھا۔ اور آج ـــــ اُف آج اُسے بیٹی کی آبرو بانٹنی تھی ـــ
رشوت کے لیئے۔ بڑے کام کا معاوضہ ـــــ تحفے کو ایک اچھے طریقے پر
پیش کرنے کے لیئے۔ بڑے کام کا معاوضہ ـــــ تحفے کو ایک اچھے طریقے
پر پیش کرنے کے لیئے اُس کو بھی ہار سنگار کرانا تھا ـــــ کتنا تضاد تھا۔
تضاد ـــــ التضاد!!

اُسے ریکھا کی ادھ کھلی جوانی کا مدوجزر ایک طوفان کے حوالے کرنا تھا
اپنے لیئے۔ دِق سے بیمار بیوی کے لیئے۔ بچوں کی زندگی کے لیئے۔ کیا وہ ایسا کرے گا

کر بھی سکے گا کیا؟ کیا اُس کا افلاس زدہ خون ــــــ رسل بھرا خون اجازت دے گا۔ وہ پھڑکے گا بھی نہیں؟ ــــــ وہ تڑپ بھی نہ اُٹھے گا۔ اُس کو غرور مفلسی کیا مٹ جائے گا۔

نہیں نہیں!

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ تو اُسے دو جلتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔ یہی آگ ختم کرنی تھی اُسے ــــ کھدر کے کرتے میں چھپی اس شیطانی آگ کو بجھانا تھا۔ بنیتا کے وحشی خمار کی تشنگی بجھانے کے لئے آج اُس کے بول کو ماننا تھا۔ اُسی منہ کے بول کو جس سے کئی بار وہ ریکھا کو بیٹی کہہ چکا تھا ــــــ اُسی بول کو! جس سے ایک دفعہ وہ ایک بڑے اجتماع میں جذباتی بن کر بولا تھا ــــ "جب تک عورتیں آزاد نہ ہوں ــــ آزادی نہیں۔ میں مرتے دم تک اس کے لئے جدوجہد کروں گا۔ بھلا یہ بھی کوئی آزادی ہے۔ کہ سماج کے مرکز عورت کو آزاد نہ کرایا جائے ــــ''

ــــــ اور ہاں آج وہ ایک عورت کو آزاد کر رہا تھا۔ ایک کنواری کی لرزتی آبرو کو مٹانے کی کوشش میں جو تھا۔ وہ بھی تو آزاد ہی ہو رہی تھی۔ اُس کی آبرو جو لٹی جا رہی تھی۔ اس لئے آج اُس کی آنکھوں میں خمار تھا ــــــ ایک ایسا خمار جو کشمیر کو موت کے گھاٹ اُتارتے وقت قبائیلیوں کی آنکھوں میں تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن ــــــ آج اس دھڑکن سے ہم آہنگ تھی۔ جو فلسطین کو لوٹتے وقت برما کا خونِ جگر پیتے وقت، ہند چینی یونان، ایران، عراق کی روح کو مسلتے وقت سامراجیوں میں تھی۔ جو کوریا کا جگر چیرتے وقت میکارتھر کے دل میں تھی۔ اُسے ایسا لگا، جیسے یہ کھدر

پوش بنیا اُسے کاٹ ہی کھائے گا۔ اس کی ریکھا کو مسلے گا، نوچے گا، تار تار کیرے گا۔ وہ آنکھیں نکال نکال کر غدار کو گھورنے لگا۔ آسمان کی اور دیکھا ـــــ اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں اُبھریں اور وہ سوچنے لگا ـــــ "میں بھی تو امن چاہتا ہوں۔ میں جنگ کہاں چاہتا ہوں۔ میں غریب ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے زہریلی گیس تلے ختم ہوں۔ میری پیاری محبوب بیوی دق کا شکار ہو ـــــ میری ریکھا شیطانی آگ میں جھلس کر دم توڑے۔ یہ ظلم ہے، چنگیز کے خیموں، ہٹلر کے جیلوں، انگریز کے کالے پانیوں، روم کی منڈیوں اور ایران کی گلیوں میں بھی یہ ظلم ڈھایا گیا تھا ـــــ انسانیت کو فنا کر دیا گیا تھا ـــــ تب بھی نوخیز چھاتیاں نوچی گئی تھیں۔ تب بھی ننگی رانوں کو گولیوں کا شکار کیا گیا تھا ـــــ تب بھی آبروئیں تڑپی تھیں، چلائی تھیں۔ تب بھی لوگ بے موت مرے تھے ـــــ اُس وقت بھی تو لوگ امن چاہتے تھے۔ صلح چاہتے تھے۔ یہ جور و ستم نہیں، یہ ظلم نہیں، اور آج ـــــ میں بھی تو امن چاہتا ہوں۔ اُس کا جی چاہا کہ زور سے چیخے۔ اتنے زور سے کہ زمین پھٹ جائے۔ اور وہ گریا ریکھا سمیت دھرتی میں سما جائے۔" میں امن چاہتا ہوں۔ اٹم بم نہیں ـــــ آبروں کی موت نہیں۔ شیطانی آگ کی آنچ نہیں۔ ریکھا کی جوانی کا سودا نہیں۔ ظلم نہیں!"

آواز اُس کے گلے میں اٹک گئی۔ اُس نے چاہا کہ ایک بار روئے خوب روئے، اتنا کہ یہ زمین آسمان اُن آنسوؤں میں نہا اُٹھے۔ اتنا کہ خدا بھی اس بہاؤ میں بہہ جائے۔ اس قدر آنسو بہائے کہ یہ ظلم ـــــ یہ ظالم ـــــ یہ نظام سب ختم ہو جائے۔

اُس نے سُنا تھا کہ غریبوں کی آہ میں اثر ہوتا ہے۔ مگر یہ اثر آج کہاں ہے ـــ وہ رو بھی نہ سکا۔ اُس کا خیالی سپنا ٹوٹ گیا۔ آنسو آنکھوں کی تہہ میں آ کر رُک گئے۔ اُنہیں آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ چپ چاپ منہ بسورے وہیں پلکوں تلے لرزتے رہے اور آہ وہ رو بھی نہ سکا۔

وہ دیکھتا رہا۔ آنسو لرزتے رہے۔ اور اُسے ایسا لگا۔ کہ یہ ظالم ٹرومین، میکارتھر اور افسر نہا شے ـــ دمشق، ایران، فلسطین کے ظالم ـــ کوریا۔ کشمیر اور ہند چینی کے جلاد ـــ اُسے گھور گھور رہے ہیں۔

ـــ دونوں جوان بحث ختم کر کے نہ جانے کب چلے گئے تھے۔ اور ہندوستان روس کی اس عظیم اور انسانیت دوست پیشکش کا خیر مقدم کر رہا تھا۔

۲۸ رجون سنہ ۱۹۵۱ء

آنسوؤں کے دیپ

(شکیل کے نام جواب اس سنسار میں نہیں)

بھینی!

تیری موت کی خبر میرے کان کے پردوں سے اس وقت ٹکرائی۔ جب میں تمہاری موت سے بالکل بے نیاز زندگی کے حسین جھولوں سے جھول رہا تھا۔ جب میں تمہارے بھوشیہ کے شاندار تاج محل کے سفید سفید سنگ مرمری ٹکڑوں سے کھیل رہا تھا۔

ایک تعمیر بن رہی تھی۔ ایک گلاب کھل رہا۔ لیکن آہ! کیا خبر تھی یہ تعمیر مسمار ہو گی اور یہ پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے گا۔ تخریب کے منحوس شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ اور آنِ واحد میں یہ حسین و جمیل یہ ضیا پاش تاج محل یہ شباب کی سرمستیاں لئے ہوئے گلاب راکھ ہو گا۔ کاش! میں پہلے ہی جان سکتا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تو موت کی گہرائیوں میں کھو جائے گا۔ کاش! سنگ مرمر کے یہ سفید سفید اجلے اجلے ٹکڑے ایک تعمیر کی ساخت ہی نہ کرتے۔ کاش! کچھ کاش ہو جاتا۔

ایک گلاب اپنی تمام لالیاں سمیٹے دھرتی کے دریچے کھول کر باہر جھانک

رہا تھا۔ اور تخریب دور منحوسی کی چھدری چھاؤں تلے ہنس رہی تھی۔ آنکھیں میچ میچ کر مسکرا رہی تھی۔ جیسے اُسے پھولوں کی جوان مرگی کا یقین ہو۔ اور

—— اور میں بے نیاز ہو کر خوابوں کے تاج محل —— بنانے میں کھو گیا تھا۔ ممتاز کا تاج محل۔ اُف میرے دماغ کے تاروں نے یہ آواز جھنجھنا اُٹھی کہ تو میری۔ کہ تخریب کی چتاؤں نے تجھے راکھ کیا۔ اور تجھ تقدس کی دیوی کو منظ راج کے ظالم ہاتھوں نے گھسیٹ کر اپنے گلے لگا لیا۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ میری روح کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور میرے خوابوں کا محل دھڑام سے زمین پر گر کر چور چور ہوا۔

میری بہنی!

تم کہاں ہو؟

تم —— کہاں ہو؟

تم۔ تم ہنستی ہو میری اس دیوانگی پر، میری عقل کے وحشیانہ پن پر۔ لیکن یہ تو جذباتی آگ ہے۔ بہنی! جس کی آنچ چاروں طرف سلگ اُٹھی ہے۔ ایک پوچھ ہے۔ ایک گھائل دل کا زخم ہے۔ جو استفسار بہ ہر لہجہ لہجہ بن بن کر رات کے گھنے سایوں کی طرح پھیل جاتا ہے۔ ہر چیز کو محسوس کر لیتا ہے اور دنیا پر بھیانک اور طویل خاموشی چھا جاتی ہے —— جانے کیوں؟ ——

اور میرے اس دیوانہ استفسار نے وادی کے ذرے ذرے سے پوچھ لیا۔ میں نے وتستا کے گنگناتے پانیوں سے پوچھا۔ گلمرگ اور پہلگام کی گھاٹیوں سے پوچھا۔ کہ "بتاؤ اے برفاب چوٹیو! اے حسین جھیلو، تقدس اور فطرت کے رکھوالو۔ کشمیر کی زندگیو تم سب جو تخریب سے نفرت کرتے ہو تم جو ٹھہراؤ سے پرہیز کرتے ہو۔ تم جو رقص کرتی ہوئی زندگی ہو، سیب کی مٹھاس ہو۔ اہربل کی آبشار ہو۔ زعفران کی بُو ہو۔ اور کڑکتی ہوئی دھوپ میں کام کرتے ہوئے کسان کی آرزو ہو۔ تم نے آج اپنی زندگی کو کیوں

بھیانک وحشی شعلوں کی نذر کیا۔ تم نے اپنے روائتی تقدس کو جلا دیا۔ تم نے حُسن کی توہین کی۔ تعمیر کو زہر آلود کیا۔ تم نے کشمیر کا خون کیا۔ اے حسین جہلو! لیکن شیل! جانتی ہو۔ میری لاجونتی! کیا جواب ملا۔ مجھے اس سب کا؟۔

اندوہناک جواب!

ایک چُپ....

بھیانک خاموشی...

ایک ماتم۔ ۔ ۔ سناٹا

لیکن میں۔ تمہیں معلوم ہے اس سب خاموشی! اس سکوت، اس ٹھہراؤ سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ چُپ، یہ سناٹا میری موت ہے۔ بینی!

کاش! یہ زعفران کی کیاریاں بھی میرے غم کا احساس کرتیں....

کاش! ان کے غم کی آگ میں جھلسے چہرے ایک لفظ کہہ دیتے۔ کہ تو کہاں ہے؛

تو! جو ہنسی کا سرچشمہ تھی!

تمہارا گلا آج کیوں سوکھ گیا ہے؟

تمہارے نغمے کہاں کھو گئے ہیں۔

تو چنار کے ایک طرف پڑی کیوں سسک رہی ہے؛

تو آج کیوں خاموش ہے؛

تمہاری نیند آج کیوں نہیں جاگتی؟

میری آنکھوں میں آنسوؤں کے دیپ جھلملا رہے ہیں۔ تو ان کو... دیکھ دیکھ کے ٹھمک ٹھمک کیوں نہیں چلتی۔

ان مدھ ماتی راتوں کو ــــ ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے۔ من کے سمندر میں آہیں ڈبکیاں لیتی ہیں۔ یہ رات جانے کیوں چھُپتی ہے اور یہ ہوائیں جانے کیوں ہولے ہولے کراہ رہی ہے۔ میرے آنسوؤں کی طرح

آکاش پر ہزاروں آنسو دیئے بن بن کر جانے کیوں تلملا رہے ہیں؟
خاموشی کے ان المناک پردوں کو چیر کر تخیل میں ایک زندگی ہچکولے لیتی ہے۔ اور میں محسوس ہی نہیں کرتا ـــــ کہ تو آج چتا کے کنارے پر چڑھی ہوئی سسکیاں بھرتی ہوئی راکھ ہو۔ جس کے ذرے ذرے میں نوجوانی کے مزار ہیں۔ تمناؤں اور کلپناؤں کا جنازہ ہے۔
ـــــ ایک تصویر ـــ ایک زندگی دیکھتا ہوں تمہاری روح کتنی مقدس ہے۔ دل میں خوشی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ لیکن پھر پاس بلکتی ایک معصوم روح "ننھے" کے روپ میں مچل اٹھتی ہے تو میرا ایک ایک احساس تلخ بن جاتا ہے۔

جب دودھ کی ایک بوند چیخ اٹھتی ہے ـــــ
جب خون کی بوندیں تڑپ اٹھتی ہیں ـــــ
جب آنکھوں میں گھٹائیں اور دل میں طوفان رقص کرتے ہیں ـــــ
تو ایک کہانی بن جاتی ہے۔ زندگی کی ترجمان تب غم جانان اور غم دوراں کی تصویر نہیں۔ ایک ہن کی۔ خون کے منجمد ٹکڑوں کی کہانی بنتی ہے اور اف! تب آنکھیں جلتی ہیں۔ دل لوٹتے ہیں۔ سینے ابلتے ہیں اور معصوم، ان جانی، ان بوجھی چیخیں دودھ کی تلاش میں تڑپتی ہیں۔ خلاؤں کو گھورتی ہیں۔ سیڑھیوں پر لپکتی ہیں۔ انصاف کی طلبگار فریادیں انصاف چاہتی ہیں۔ بے زبان خاموشی جینے کا حق مانگتی ہیں۔ ماں کے دودھ کا حق۔ خون کی رگیں خون کا ابال مانگتی ہیں۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے دیپ انتظار کرتے کرتے بجھ رہے ہیں۔ وہ خوشی کا وفور چاہتے ہیں ـــــ تم ان کو دیکھ دیکھ ٹھمک ٹھمک کیوں نہیں آتی؟

کیا تم نہ آؤ گی؟

مانسبل جب سوکھ گیا

آگ کی گرم لپیٹوں کی تاب نہ لاکر وہ نیم مردہ سا ہو چکا تھا۔ لیکن زبان سے "اُف" بھی نہ کرتا ہوا اپنے کام کو جلد جلد نہایت ہی انہماک سے ختم کئے جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا غالباً اُس نے مستقل ارادہ کیا ہے کہ جب تک کام ختم نہ ہو دم نہ لوں گا۔ بار بار وہ دروازہ کی اور دیکھتا لیکن ہر بار اُسے ناکامی ہوتی اُس کی یاس آمیز پلکوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ نگاہیں دور خلاؤں میں اُلجھ گئیں تھیں۔ لیکن وہ نہ ملتا جسکی تلاش تھی۔ وہ ایک لمبی آہ بھرتا اور سامان سُرعت سے نبھائے پولو گراونڈ لے جاتا آس پاس کی دو کالونوں سے خوف اور خطرہ کی مِلی جُلی چیخیں فضا میں ڈول رہی تھیں۔ لوگ اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے ...... چلاتے۔ شور مچاتے ایک دوسرے کی مدد کرتے لیکن "اُف" اِس بچارے کی کوئی نہ پوچھتا ...... شاید وہ بوڑھا جو تھا۔

نہ ہی لوگوں کی دِل خراش آہیں۔ جگر کو پھاڑنے والی چیخیں کلیجہ میں زیروبم لانے والے آنسو ـــــ آگ کی گرمی۔ آگ کا لپک کر منٹوں میں عالیشان دوکانات کو خاکستر کرنا، اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اُسے غرض تھی تو بس سامان لے جانے کی!

نزدیک ہی ایک دوکان آگ کی خوفناک آغوش میں سِسکیاں لے رہی تھی۔ خوف اب اُس کو بھی چمٹنے لگا تھا۔ لیکن وہ کام کیے جا رہا تھا، کثرت کام تنہائی اور خوف سے اُسکی کمر دُکھنے لگی تھی۔ لیکن وہ کر رہا تھا کام ـــــ

"میرے مالک! .....، وہ بڑبڑایا
میرے سرتاج ...... جب تم آؤ گے تو ـــــ تو ـــــ"
کثرت غم سے اُس کی چیخ نکل گئی۔

وہ اب بھی کام کر رہا تھا۔ لیکن اب اُس میں وہ سرعت اور تیزی نہ رہی تھی۔ اس میں قدرے توقف آچکا تھا۔ اُس کی چال میں ایک اضمحلال سا چھا چکا تھا۔ اور وہ غنودگی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ سامان نصف سے زیادہ پولو گراؤنڈ آچکا تھا۔ آخری بار جب وہ سامان چھوڑ کر واپس آگیا ـــــ تو دکان کی جلتی ہوئی چھت اُسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"ـــــ آہ! میرے آقا..... کیا تم نہ آؤ گے۔ دیکھو دیکھو جل رہے ہیں میرے ارمان، میری آشائیں۔

غم اور خوف سے اُس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اسکی بوڑھی تمکنت لڑکھڑا کر دم توڑ گئی، پھسل گئی، کراہتی ہوئی۔ بھاگ کر دور آگ میں کھو گئی۔ اور پیلے پیلے رنگ اُبھر آئے۔ آگ دوکان کو لگ چکی تھی۔ شعلے آسمان کا مُنہ چڑھا رہے تھے اور آگے آگے دیوانہ وار بڑھے جا رہے تھے۔
ارے ـــــ وہ وسکی..... اسکاچ ... وائٹ ہاؤس

...... ڈی ...... جانی واکر ـــ بلیک اینڈ وائٹ۔

...... "بچاؤ بچاؤ"۔

وہ چیختا رہا۔ آہیں تڑپتی سسکتی مرتی رہیں۔

وہ بے ربط کہتا گیا۔

"میرے پیارے ـــ! ایک سجی سجائی الماری سے چمٹتے ہوئے وہ بولا۔

"چھوڑ رہے ہو اب کیا ـــ بے وفا"

پیار ایک ایک لفظ میں ڈوبا ہوا تھا ...... ایک بے پناہ پیار ... ایک ایسا پیار جو صرف "پیار" ہے۔ وہ آج حماقتوں پر تلا ہوا تھا

دوکان نصف کے قریب جل چکی تھی۔ گرم لپیٹوں سے اس کا جسم شعلہ زن تھا۔ جسم کے اکثر حصے جھلس چکے تھے۔ پھر بھی وہ باقی ماندہ سامان لے جانے کی ٹھان میں تھا۔

"مالک ...... کہاں ہو آج تم؟"

اُس کی چیخ آگ کے پٹاخوں سے ہم کنار ہوئی۔

چٹک چٹک ـــ چٹاخ! آگ کے گولے برستے رہے۔

آگ نے دوکان کا محاصرہ کیا۔ اب بھی وہ آیا ...... بچی کھچی چیزوں کو قمیض میں رکھ کر وہ زندگی سے بے نیاز دروازہ کی اور بڑھا شعلوں کے درمیان ـــ اُس کے کپڑے آگ کی تاب نہ لاسکے۔ اور راکھ ہوئے۔ ایک جلتا ہوا لٹھ اُس کی کمزور اور بوڑھی گردن پر گر پڑا ـــ

"اُف ـــ اُس کی بوڑھی زبان تتلائی۔

خون کا ایک فوارہ اس کے سر سے پھوٹ بہا۔ لیکن دوائیاں چھوٹی نہیں ـــ وہ برابر قمیض کے دامن میں لرز رہی تھیں۔

پولو گراونڈ پہنچ کر اس کی حالت بدل گئی ـــ اُس کے منہ پر موت منڈلانے لگی اور وہ دھڑام سے اوندھے منہ زمین پر آگرا۔

"میری دوکان"..........

الوداع.......... میری سنبھالی ہوئی چیزو.......

خدا حافظ۔ خدا ہی اب مالک ہے۔

آقا.... میرے آقا.... آو — آو بھی نا؟

نہیں آؤ گے — میں اب مجبور ہو رہا ہوں۔ آخری بار بھی.....

اُس کی آہ و زاری فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن میں کھو گئی۔

وہ رو رہا تھا — اُس کی پلکوں میں ساون کی گھٹائیں تھیں....

..... برسنا چاہتی تھیں وہ — مگر یہ گھٹا — گھٹا ہی رہی

آنسو لرزتے ہی جا رہے اور — اُس کی بوڑھی جوانی —

جاڑے کی چاندنی کی طرح بیکار تھی!

وہ اُس پر ماتم کر رہی تھی — خون جم چکا تھا....

پھٹی پھٹی نگاہیں خلا میں گھورتی رہیں — اور شام دور کراہ رہی تھی۔

شام کی دھند پھیل گئی

فضا غبار سے بھری ہوئی تھی۔ آگ پر قابو پایا جا چکا تھا۔ شور قدرے دھیما پڑ چکا تھا۔ بجھے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے بھاپ منتشر ہو رہی تھی — اور آسمان پر چاند پھیکی شراب برسا رہا تھا۔

"آقا..... میرے آقا!"

ہونٹ ایک بار پھر پھڑکے۔ پلکیں لرزنے لگیں۔ اور....

..... اور وہ خیالات کی دھاریں بہتا گیا — آج سے ٹھیک چالیس برس پہلے وہ بھی ایک "آقا" تھا...... ایک سرمایہ دار کا بیٹا — لاکھوں کی آغوش میں کھیلنے والا۔ جب.... جب

.....

سنیما کے پردوں پر ہلتی ہوئی تصویروں کی مانند اُس کا دل بھی ہلتا گیا۔ ہلتا ہی گیا۔ خیالات — بہتے چلے.... تحت الشعور میں بکھرے

جذبات اکٹھے ہو گئے اور . . . .

زندگی کی وہ حسین و رنگین سپنے اُس کے سامنے تھے۔ ماضی کے وہ دلفریب سائے اُس کے پاس کھسک آئے۔ چمکتے دن . . . عیش کے دن! پیار کرنے کے دن!

وہ بھی ایک امیر باپ کا لڑکا تھا . . . . گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار۔ آنند بابو کا اکلوتا بیٹا . . . . . "رئیس کا بیٹا" وہ مسکرا دیا۔ گھر والے اُسے سورج کہا کرتے۔ لیکن گاؤں بھر میں وہ "چھوٹے بابو" مشہور تھا۔ اپنا نام یاد آتے ہی اُس کے مُنہ پر ایک غم کا احساس چھا گیا۔ وہ اپنے نام کو گھورتی نظروں سے محسوس کرتا رہا۔

کبھی س اور و کو لمبا کر کے . . . . س . . . . و . . . . ر . . . . ج . . . . ج کی تتلاہٹ میں۔

اوہ؛ کتنے اچھے تھے وہ دن ــــ میٹھے ــــ اور اُسے وہ رس گلے یاد آئے جو اُس نے ایک بار مالتی کے مُنہ میں رکھے تھے تو وہ بولی تھی . . .

"سورج! یہ کیا ہے"

"رس گلے ــــ پگلی" اُس نے کہا تھا۔

"کیا کہا . . . رس گلے۔ وہ کیا ہوتے ہیں؟!"

اور ــــ سورج شدتِ جذبات اور پیار میں اندھا ہو گیا تھا۔ اُس نے زعفران کے پھولوں کو اکٹھا کر کے اُسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔

"یہ ہوتا ہے رس گُلہ" اُسے چومنے کے بعد وہ بولا تھا۔

اُس دن بہت دیر تک وہ ہنستے رہے تھے اور جب مالتی بہت دیر تک اپنی ہنسی روک نہ سکی تو سورج نے کہا تھا ــــ

چُپ رہ ــــ مالتی! کہیں یہ ہنسی اُلٹی ثابت نہ ہو جائے"۔
اور تب مالتی نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔
"کیسی باتیں کرتے ہو ــــ سورج!"

اِن دلوں کے احساس سے وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس کے دل پر آرے چلنے اور اُسے ایسا دکھائی دیا۔ گویا مہورہ کے پاور ہاوس نے اُس کا خون چوس لیا ہے۔ اُس کی بجلی کی ایک "رو" سی کھنچنے لگی۔ دِل دھڑکتا رہا۔ دھک دھک......

...... سورج کی ماں بچپن میں ہی اُسے چھوڑ کر موت کی خندق میں ڈوبی تھی۔ اس لیے سبھوں کے پیار کا مرکز وہی تھا۔ لیکن انتہائی پیار ہونے کے باوجود وہ پیار کا بھوکا تھا۔ وہ محبت چاہتا تھا ــــ اس لئے ایک پیار بھرا دل پاکر وہ جھوم اُٹھا۔ لیکن اِس تمام کا عکس اُس کے دل پر پڑتے ہی وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس کے تخیلات میں نٹ راج ناچنے لگا۔ دھم دھما ــــ دھم دھما......

اُس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں...... اُس کے ذہن کے پردوں پر ایک تصویر رقص کرنے لگی...... ایک اِنسان...... ایک پھول...... ایک زعفران کا پھول رقص کرنے لگا...... یہ تصویر اُبھرتی گئی...... اُبھرتی اور ڈوبتی...... بھیانک اور ڈراونی...... اماوس کی رات کی طرح...... آہستہ آہستہ سیاہ نقوش سفیدی میں بدل گئے۔ تصویر اب صاف تھی...... دودھ ایسی؟

یہ...... مالتی...... ما...... لتی

درد اُس کی رگ رگ میں ہو اٹھا...... ما...... لتی...... "وہ چلایا۔ مالتی ــــ اُس کی مالتی!

ایک غریب دیہاتی لڑکی تھی وہ ——— کشمیر کے دیہاتوں کی حسین پری!
اُس کے حسن میں کشمیر کے آبشار ——— لالہ زار اور سبزہ زار پہناں تھے
وہاں کشمیر کی سنہری سفید پہاڑیاں تھیں۔ وہاں چشمے تھے ———
میٹھے پانی کے چشمے!

اور ——— اور یہ تھی مالتی!

اور ایک دن.........

سبز سے گرتے ہی دھان کے کھیت میں اُن کی ملاقات ہوئی۔ نگاہیں ملیں اور دل بھی ملے ——— وہ دھان کے کھیت میں بیٹھی چڑیاں اور پرندے اُڑا رہی تھی ——— اور پرندے اُسے تنگ کرنے کے لئے پھر آ بیٹھتے ——— وہ بار بار غلیل سے پتھر پھینکتی۔

سورج ——— یہ منظر دیکھ رہا تھا...

"لائیے میں اڑا دوں" اُس نے کہا۔

اور وہ شرمائی ——— لجائی! سر سے پیر تک شرم کی ایک رو سی پھیلی اور غلیل اُس کے ہاتھ سے چھوٹا......

سورج پرندے اُڑا رہا تھا ——— اور خود اس کا دل بھی اُڑ گیا۔
اُس کے ساتھ ہی اُسے بھی ایک دل ملا...... ایک افسانوی دل!
ایک رنگین و حسین تتلی کا دل ——— جس کی آنکھوں میں کشمیری سیبوں کی جھلک اور مانسبل کی گہرائی تھی!

اور

ایک لمبی رومانی داستان شروع ہوئی۔ دھان کے کھیت کا تصادم دلوں کا تصادم بن اٹھا...... غلیل کے ذریعے پتھر کے ساتھ دل بھی پھینکے گئے۔ دل دل سے بڑھتا رہا۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں ——— اور پیار

کا موزی دیوتا مسکراتا رہا۔

مانسیل کے ننٹ پروہ ملے۔ گلاب کی جھاڑیوں کے پیچھے اُن کی ملاقات ہوئی۔ چاند اپنی شرمیلی دھوپ برساتا اور سمبل جانے والی لجائی سی نازک پگڈنڈی سے ہٹ کر چنار کے جھرمٹ اور بید کے سایوں تلے اُن کی محبت میں لچک آئی ——— اُس کا بچپن گذرا۔ اور جوانی میں قدم رکھا۔ لیکن اُف محبت دم توڑ کر رہ گئی ——— وہ جوان مرگ ہوئی!

گاؤں بھر میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی اور غریب مرتے رہے۔ . . . . . . گاؤں بھر کا زمیندار آنند بابو اپنی رعایا کو اسی حال میں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا اور سورج کراہتا رہا۔ لیکن اُس کا دِل شہر میں لگا نہیں۔ ایک دن وہ بھاگ کر واپس گاؤں چلا آیا۔

لیکن آہ! . . . . . . محبت دم توڑ رہی تھی . . . . . . پیار جوان مرگ ہوا چاہتا تھا۔ مالتی ہیضہ کی زد میں آچکی تھی۔ اور دوسرے دن اس پیار کرنے والی تتلی نے ایک اُڑان لی ——— ہمیشہ کی اُڑان!

سورج کی دنیا ویران ہو اُٹھی ——— وہ سن سے رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں قبرستان کا سناٹا چھا گیا۔ اُس کا دماغ مفلوج ہو گیا۔ . . . . اُس کی روح کچلی گئی۔ زعفران مُرجھا کر گر پڑا۔ اور پھول . . . . . . کشمیر کے حسین پھول موت کے ہاتھوں نوچ لیے گئے . . . . . . مالتی . . . . . . پھول . . . . . . جل گیا! سورج چونک اُٹھا۔ اُسے وہ ہنسی یاد آئی جب اُس نے مالتی کو جھنجھوڑا تھا۔

مالتی ——— کہیں یہ ہنسی اُلٹی ثابت نہ ہو" اور آج وہ ہنسی اُلٹی ہی تو ثابت ہوئی تھی۔ وہ ہنسی ——— "ہنسی" بن گئی تھی۔ آج وہ ہنسی موت کی گہرائیوں میں ڈوبی تھی۔ اُس کی رگ رگ بغاوت پر تلی

خدا سے بغاوت! اُس کا دِل و دماغ ۔۔۔ جسم ۔۔۔ خیالات سب باغی بن اُٹھے اور ایک رات وہاں سے سرینگر چلا آیا۔ وہ اب ایک آوارہ تھا۔ وہ فاقے کرتا ۔۔۔ یا کبھی کبھار سینما کے اشتہار دیواروں پر لگاتا تو اُسے روٹی ملتی ـــــ اب وہ ایک ہڈیوں کی مالا تھا۔ لیکن تب ایک دیپک پھر اُس کے جیون میں جھلملا اُٹھا۔ اُس کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی ـــــ

وہ پولو گراؤنڈ کی طرف جا رہا تھا ۔۔۔ اُس کے تصور میں مالتی ہچکیاں لے رہی تھی۔ تو اُس نے مالتی کو دیکھا ۔۔۔ مالتی ایک نوجوان کے روپ میں چل رہی تھی۔ اِس نوجوان کی آنکھوں میں مانسبل کی گہرائی تھی۔ کشمیری سیبوں کی جھلک تھی۔ اُس نے وہاں افسانوں کو تعمیر کئے پایا اور ـــــ اور وہ مالتی کو پا چکا تھا۔

سورج اِس نوجوان کا گرویدہ بن گیا۔ وہ ایک تاجر تھا ـــــ اُس کی اپنی دوکان پولو گراؤنڈ سے ملحق POLO VIEW کے نام سے مشہور تھی۔ اُس کا نام ٹھاکر داس تھا ۔۔۔ ٹھاکر داس نے سورج کی آنکھوں میں تجسس اور تذبذب کو انگڑائیاں لیتے پایا۔

"نوکری کرو گے؟ نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ اگر آپ کو ضرورت ہو تو ۔۔۔!"

ٹھاکر کو اپنی دوکان کے لئے ایک معصوم سے انسان کی ضرورت تھی۔ وہ فوراً اُسے دوکان میں لے گیا ـــــ

یہی نوجوان ـــــ آج سورج کا آقا تھا۔

وہ آقا تھا ۔۔۔ وہ مالتی تھی ۔۔۔ وہ سورج کی زندگی کا چراغ تھا۔ "آقا ـــــ میرے ۔۔۔ مالتی"

وہ دیوانہ وار چلایا ——— آواز فضا کو روندتی چلی دی اور وہ سوگیا۔

چند لمحوں کے بعد قدموں کی چاپ سُنائی دی۔

سورج ——— میرے پیارے شاباش" بوڑھے کا آقا نوکر کی جاں فشانی

پر حسرت سے جھوم اُٹھا ——— اور اُسے گلے لگانے بڑھا۔

لیکن وہ سوچ چکا تھا ——— آگ بجھ چکی تھی۔

"آقا" ———

دُور کوئی پرندہ چلایا۔ ہنسی مری۔ نغمے کی روح موت

کی گہرائیوں میں کھو چلی اور ——— اور خون جم چکا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہیں خلا کو گھور رہی تھیں۔

——— آگ بجھ چکی تھی!

دسمبر ۱۹۴۹ء

———

یاد

میرے رفیق ــــ کل رات کو ــــ
دُلر کے حسین آغوش میں
لہروں کی چینچلتا میں
ہوا کی میٹھی تان میں
میں نے.......چاند کی بارش تلے
اس سے ــــــ ملاقات کی
وہ ایک ملاح تھا ــــ ایک بوڑھا ملاح!
کچھ کھویا کھویا سا تھا ــــ وہ!
اس کی پلکیں......بھیگی بھیگی سی تھیں
اس کے چہرے سے.....
حزن وملال ٹپک رہا تھا۔
وہ ــــ دھیمے دھیمے ناؤ چلا رہا تھا!
اُس کے جھُریوں بھرے ہاتھ
چپو سے سرگوشیاں کر رہے تھے ــــ وہ جا رہا تھا۔
ایک گیت گنگناتا ہوا ــــ دھیمے دھیمے ــــ

درد ناک لے میں — یہ گیت . . . . . یہ لے . . . . یہ انداز!
غمناک سا تھا — ایک درد لئے ہوئے۔
میں — تڑپ اُٹھا۔
میں نے اُس سے پوچھا۔ وہ مسکرادیا۔
اُس کے بوڑھے آنسو!
اُس کے سفید ریش پر ڈھلک آئے۔
وہ بولا . . . . . "میں ماضی کو ٹٹولنے — چلا ہوں"۔
یہ کہتے کہتے . . . . . اس کا گلا رندھ گیا۔
اس کے نین بھر گئے۔
ایک گھاؤ پھر کھُل گیا۔
ماضی کی ایک ناکام کہانی
اُسے —
ستا رہی تھی!

- - -

روزنامہ "جیوتی" سرینگر

۱۹۵۴ء

شرنارتھی

(لشکر ناتھ ساغر کے نام)

موٹر برق رفتاری سے جا رہی تھی۔

آج سیٹھ صاحب کار خود ڈرائیور کر رہے تھے۔ اُن کے دل میں خیالات کا طوفان تھا جیسے وہ سگار کے دھوئیں تلے کھونا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کا دل چکنائی کے بے پناہ انبار ملے بھی دھڑک رہا تھا۔ کار کے آگے لگا ہوا قومی پرچم سیٹھ صاحب کی "قوم پرستی" کا شاہد تھا۔ اس پرچم کے سائے میں اُن کے بہائے گئے خون کا ایک ایک قطرہ عیاں تھا۔ جیل کی اذیتوں، زندان کی سختیوں لاٹھیوں اور گولیوں کے "داغ" صاف طور نظر آ رہے تھے —— اُن کی آسٹن بذاتِ خود اُن کی بڑی "قربانی" کا اعلان کر رہی تھی۔ جس کا ڈھونگ رچا کر آج حکومت کے ایوانوں میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

ریت اور مٹی کے امتزاج سے بنے ہوئے ذرے روندے جانے کے بعد چپکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کار کے پیچھے بھاگتے۔ لیکن مایوس ہو کر پھر

اپنی اپنی جگہوں پر پلٹ آتے ۔

میونسپل گراونڈ کے موڑ پر وہ جا رہا تھا۔ بھوک سے نڈھال اُس کا یاس آمیز چہرہ اُس کی تباہ حالی کا ضامن تھا۔ اُس کا سسکتا ہوا پسینہ سوکھا منہ اور آہ اس کی لڑکھڑاتی لرزاں ٹانگیں اسے "شرنارتھی" کی سند بخش گئی تھیں۔ اور وہ جوان بوڑھا زندگی کی موت میں سمٹا سمٹا یا نیز تیز چلنے کی سعی کر رہا تھا۔ لیکن اُس کی ٹانگوں میں وہ قوت نہ تھی۔ سیٹھ صاحب کی آسٹن جا رہی تھی۔ اور وہ برابر دل کے طوفان میں گم تھے۔ دھوئیں کے مرغولوں میں کھوئے تھے۔ اور وہ جا رہے تھے ___

شرنارتھی کاندھے پر ایک بھاری صندوق اٹھائے جا رہا تھا۔ دو انسان جا رہے تھے، سرمایہ جا رہا تھا۔ بھوک جا رہی تھی۔ تکبر اور نخوت جا رہا تھا۔ بے کسی اور حلیمی اور مجبوری جا رہی تھی۔ شیطانی خمار جا رہا تھا۔ تقدس کا احساس جا رہا تھا دھیمے دھیمے دردناک انداز میں.....

بھوک نڈھال تھی، چل نہ سکی۔ شرنارتھی موڑ کے نزدیک پہنچ چکا تھا آسٹن مسکرائی۔ یاس تیز قدموں چلنے لگی۔ اس کا دم پھول گیا۔ پسینے نے ساون برسایا۔ اور موڑ ٹھیک اس کو روندتی ہوئی چل دی۔

دھماکہ ہوا! ایک چیخ فضا کو چیرتی ہوئی ستاروں سے ٹکرائی ___ خدا سے ٹکرائی ___

پولیس کا سپاہی موقعہ پر آیا۔

موٹر رکی۔ سیٹھ صاحب اپنے پیٹ کو تھامے آہستہ سے موٹر سے اُترے۔ سنگار کے دھوئیں تلے اُن کی نظریں مرتے ہوئے انسان سے ملیں۔

کم بخت۔ دیکھتے نہیں ہر وقت سڑکوں پر مرے جا رہے ہیں ___ آنکھیں جیسے پھوٹ گئی ہیں۔ کم بخت.... پاجی.... سالا... ایک

لات مردہ جسم سے لگی۔ سیٹھ صاحب نے ٹیلیفون کردایا۔ اور "ایک اچانک موت" کہکر شرنارتھی کی لاش پوسٹ مارٹم کیلئے بھیجدی گئی۔ اور آسٹن ایک خفیف مسکراہٹ مُنہ پر لاکر چل دی۔

قومی پرچم چل دیا۔ آسٹن چل دی۔ سرمایہ اور غرور چل دیا۔ سیٹھ صاحب چل دیئے۔ موٹر سے اُترتے انہیں موچ آگئی تھی۔ یہ سارا قصور کم بخت شرنارتھی کا تھا۔ رہناؤں اور آسٹن جیسی کاروں کے مالکوں سے غلطی کیسے ہوسکتی ہے۔ کھدر کے کرتوں میں ملبوس انسان پاپ نہیں کرسکتے۔ وہ قوم کے لئے جیل جاتے ہیں۔ گولیاں کھاتے ہیں۔ مرتے ہیں اور.... انہی کم بختوں کا سدھار چاہتے ہیں۔ اُن سے غلطی۔ توبہ۔ ہونہہ۔ ذلیل۔ شرنارتھی۔ وہ ایک شرنارتھی تھا۔

ایک ایسا انسان جو پھر کبھی سنبھلتا نہیں۔ جو دنیا جہاں کے مصائب برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیاس بھری آنکھیں آج سے پانچ سال پہلے شراب برسا رہی تھی۔ وہاں اختلاج قلب کا روگ نہ تھا وہاں ارمانوں کا جھرمٹ تھا۔ بھاؤناؤں کا ساگر تھا۔ اس کا آبائی وطن مظفرآباد تھا۔ اس نے زندگی کے بہترین دن دیکھے تھے۔ کس قدر خوش حال تھی اُس کی زندگی۔ آج سے بالکل متضاد۔ بالکل مختلف۔ جب وہ اس یک لمی احساس کو اپنی آنکھوں سے گھورنے لگتا تو اُس کی آنکھوں میں نور کی کرنیں عود کر آتیں۔ لیکن پھر وہاں قبرستان کا سناٹا چھا جاتا۔ اس کے معصوم پن کا نام ٹھاکر تھا۔ ضلع بھر کے خوش حال اور رحم دل کسان ماتا دین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ گھرانہ بھی کیا تھا۔۔۔ ایک چھوٹا موٹا خاندان.... وہ تھا.... اسکی ماں اور اس کا بوڑھا باپ۔ پاس کے ایک دیہاتی سکول میں وہ آٹھویں جماعت تک پڑھ چکا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے کو وہ اور جاری رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ماتا دین نے روک لیا۔

ٹھاکر بیٹا! اب یہ پڑھنا وغیرہ فضول ہے۔ چھوڑ دو اور اپنے آبائی کام میں لگ جاؤ۔"

لیکن بابا میں تو پڑھوں گا" اس نے انکسار سے کہا تھا۔

"دیکھو بیٹا! اچھے بیٹے باپ کا کہنا نہیں ٹالتے"۔ اس جواب نے اس کے جذبات کو روک دیا۔ اور اس دن اُس نے تعلیم کے خیال کو دل سے باہر پھینک دیا۔ دن بیت چلے۔ پانی کے بھاؤ کی طرح۔

زندگی اسی محور پر گذر رہی تھی۔ دن بھر کھیت میں کام ہوتا۔ اور شام کو بانسری کی تان فضا میں گھل جاتی۔ نغمے تڑپتے گیت مچلے اور ہونٹ تھرکتے رہتے۔ ایک شام مرلی کی لے نے اُسے ہمیشہ کیلئے ایک دوسری ہستی کا بنالیا۔ شام جوبن پر تھی۔ چاند مستی برسا رہا تھا۔ اور وہ گا رہا تھا۔ ہونٹ متحرک تھے۔ بانسری بج رہی تھی۔ نغمے پھوٹ رہے تھے۔ اور وہ ڈوب رہا تھا۔ اکثر شامیں ایسی ہی رومان بدوش ہوتیں پنگھٹ کے کنارے "جوانیوں" کا گداز مچلتا اور کتنے ہی کان اس نغمے میں زندگی کو محسوس کرتے۔ کتنی ہی نظریں پتھرا جاتیں لیکن اُس دن اُف وہ اُس دن کو بھول نہ سکا۔ یہ دن اس کی زندگی بن کے اُٹھا۔ اور وہ اس تلاطم میں بہکے بہت دور کنارے لگا۔ وہ گا رہا تھا۔ اور آشا سُن رہی تھی۔ آشا ... گاؤں کی حسین جل پری! تم کتنا اچھا گاتے ہو۔ تمہاری بانسری ...." وہ اچانک بولی! سچ ... اور وہ مسکرا دیا۔

"تمہارے بول کتنے اچھے ہیں اور تم ...." اور وہ لجا سے لال ہوئی "پگلی میں ... "اوں ہنھ"

اور اس کی زندگی کا ایک زریں دور شروع ہوا۔ وہ پیار کے سنگیت میں کھو گیا۔ آشا ایک چمکتے دیپ کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اس کی زندگی کیف آور خوشی کی بے پناہ وسعتوں میں کھو چکی تھی۔ مگر دو سال جلدی

چلے گئے۔ اُس کی خوشی میں بہار نے وہ بہار دکھائی کہ بہار خود بھی تلملا اُٹھی لیکن خوشی انجام میں ایک جذباتی خودکشی بن اُٹھی۔

ایک منحوس صبح ــــ پو پھٹنے سے پہلے ہی فضا پر ماتم چھا چکا تھا۔ زمین اور پہاڑوں پر ایک کپکپاہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔ دور پہاڑی کی معصوم پگڈنڈی پر ایک کارواں جا رہا تھا۔ دھماکے ہونے لگے۔ دھرتی کانپ سی اُٹھی.... ڈر ڈر... خوفناک مہیب آوازیں ڈولنے لگیں۔ لوگ حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات میں کھو گئے۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ فضا کی گھٹنا کی ــــ یہ آوازیں ــــ یہ دھماکے ــــ اِن کے مقدس اور معصوم دماغ اس کی تھاہ نہ لے سکے۔

کارواں گاؤں کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ عجیب لباس اور عجیب شخصیت کے یہ انسان وحشیانہ ہنسی ہنس رہے تھے۔ کندھوں پر بندوقیں تھیں۔ آتے ہی اُنہوں نے گاؤں کی بیٹیوں اور بہوؤں کے ساتھ چھیڑ کی۔ ماتا دین اور رحیم گوجری تڑپ اُٹھے۔ اُن کی غیرت یہ برداشت نہ کر سکی۔

گاؤں میں خیر ہوئی۔ ماتا دین نے ایک لاٹھی کی ضرب سے ایک شیطان کو ختم کر دیا۔ ــــ "کم بخت تم بہو بیٹیوں والے نہیں ہو! خدا تم پر آفت نازل کرے گا ــــ"۔ اس لفظ کے ساتھ ہی قبایلی نے بندوق اس زور سے مارا، کہ ماتا دین نے وہیں پران دیئے۔

رحیم گوجری دوسرے کا شکار بن گیا۔ دھماکے ہوتے رہے۔ بندوقوں کی کرخت آوازیں آکاش کی طرف اُٹھتی گئیں۔ دھواں پھیلتا گیا۔ گاؤں کی پاکیزہ روحیں ختم ہوتی گئیں۔ سہاگ لُٹتے رہے۔ بچے یتیم بنتے گئے۔ عصمتیں لُٹتی گئیں۔ بوڑھے بے سہارا بنتے گئے۔ شیطان قبایلی خوشی اور مسرت کے جھرمٹ میں قہقہے بکھیرتے گئے اور ــــ اور بھگوان یہ سب کچھ دیکھ کر ڈرتا رہا ــــ کانپتا رہا اور.........

شیام یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کی روح کی عصمت

ٹوٹ گئی۔ اُس کے بوڑھے غیرت مند باپ کو لقمۂ اجل بنا دیا گیا۔ وہ دیکھتا رہا اور آنکھوں کی راہ خاموش شرارے برساتا رہا۔

پرندوں کا ایک غول چیختا چلاتا آسمان پر اُڑ گیا۔!

مظفر آباد آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ شعلے اور دھویں سے آسمان شعلہ ریز تھا اور اس کے ساتھ گرم خون بہتا گیا۔ چیخیں، آہ و کرب....

آہیں فضا میں تحلیل ہوتی گئیں۔ شیام اور اُس کے ہم سن جوانوں پر تو خیر کچھ رحم ہوا اور اُن کو اپنی حراست میں رکھ کر مختلف کاموں پر تعینات کیا گیا۔ وہ ہر روز اپنی بوڑھی ماں سے ملتا۔ جس سے چکی پیسنے کا شدید کام لیا جا رہا تھا ـــــ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو جھلملاتے رہتے۔ شیام یہ سب برداشت نہ کر سکا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کی پھولی ہوئی رگیں دیکھ نہ سکا..... جو کثرت کام سے پھٹ جانے کو تھیں.....

وہ اپنی ماں کا اُداس ـــــ اُترا ہوا اور غم کی آگ میں جھلسا ہوا چہرہ نہ دیکھ سکا ـــــ اور آخیر ایک رات دوسروں کی عدم موجودگی میں وہ اپنی بوڑھی ماں کو کندھے پر اُٹھا کے چھپتا چھپاتا چل نکلا اور چلتا رہا ـــــ ذراسی آہٹ پر وہ سانس روکے زمین کے ساتھ لپٹ جاتا۔ اور پھر وہ چل دیتا ـــــ

پو پھٹنے سے قبل وہ پہاڑی راستوں کو طے کر تا ـــــ ایک دور کی پہاڑی پر کھڑا تھا۔ وہاں سے اُس کو اپنے گھر اور گاؤں کے کھنڈروں کی تڑپتی ہوئی آہیں سنائی دے رہی تھیں۔ شیام رو اُٹھا ـــــ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

اور روندھی ہوئی آواز میں چلا اُٹھا ـــــ

"ہائے! دیواروں کے مٹتے ہوئے نقش دلنگار تم فضا کو اور غم گین کیوں بنا رہے ہو۔ میرے اُجڑے کاشانے! میں تم پر مرا کیوں نہیں۔ تم ہی ہو جنھوں نے میرے روح کو تابندگی اور لچک بخشی تھی۔

میرے پیارے! اب مت رو۔ بہت رو چکے آہ! کاش میری زندگی تم پر نچھاور ہوتی۔۔

میں جا رہا ہوں۔ الوداع! میری جنم بھومی!

میرے ساتھ پلے بڑھے بھائیو۔ دوستو، رفیقو! الوداع میں اب جا رہا ہوں...... میں..... جا...... رہا...۔ ہوں حسرت تو تھی کہ تم سے نہ چھٹتا۔ اپنے گھر سے اپنے دم توڑتے ہوئے کاشانے سے جدا نہ ہوتا۔ لیکن مجبوریاں معذور کر رہی ہیں۔ آہ!

—— اور پھر ایک ٹک اپنی بوڑھی ماں کو دیکھا —— جو بچے کی حالت دیکھ رہی تھی —— اُس کے ہاتھ پاؤں جیسے مفلوج ہو چکے تھے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اُس کے ماتھے پر ایک ناکام ولولہ چمک رہا تھا۔ اُس کی بوڑھی جوانی اس کو تھمانے کی کوشش کر رہی تھی اور —— اور آہ! وہ رو رہی تھی۔!

شام کے لوٹتے ہوئے دل پر ایک اور چوٹ لگی...... وہ مُنہ دوسری طرف پھیر کے بہت دیر تک پلکوں میں آنسو چھپائے رہا اور حسرت سے اپنے مٹے اور اُجڑے ہوئے کاشانے کو تکنے لگا۔ اور پھر شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

"ماں چلو! اور وہ چل دیئے۔ دن رات چلتے بنے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں لہولہان ہوئے۔ اُن کے بال پریشان۔ اُن کی صورت مضمحل اور اندوہناک تھی۔۔ آخر دوسرے دن شب کو وہ بارہ مولہ وارد ہوئے۔

انڈین ملٹری کا تسلط بارہ مولہ تک چھا چکا تھا۔ جو لوگ بچ گئے تھے اُن کی مُردہ جان میں پھر سے جان آگئی تھی گو اب بھی یاس ٹپک رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا —— اور اس وقت شام اپنی ماں کا ہاتھ تھامے

بارہ مولہ پہنچا۔ ڈیوٹی پر لگے ہوئے سپاہی نے فوراً ان کو حراست میں لے لیا۔ اور اپنے آفیشیٹنگ کمانڈر تک لے گیا۔ اُن کا بیان قلمبند کیا گیا۔

دوسرے دِن ٹرک میں لاکر اُن کو سری نگر ملٹری کوارٹر میں بھیج دیا گیا۔ جہاں ہفتہ بعد اُن کے بیانات اور رپوٹیں لی گئیں۔ اور شام نے روتے روتے اپنی بیتی کہہ سُنائی۔۔ ایک ہفتہ کے بعد اُن کی جان چھوٹ اور اُنہیں ایک ریفوجی کیمپ میں جگہ مل گئی۔

پناہ گزینوں کے کیمپ میں وہ تین ماہ رہا۔

اور جو کچھ اُس نے وہاں دیکھا۔ اُس سے اُس کی ضمیر کانپ اُٹھی۔ اُس نے اپنے سامنے ماؤں اور بہنوں کو دیکھا۔ جن کو جارحانہ طور پر الوان گناہ کی اور قدم بڑھانا پڑتا۔ اُس نے معصوم بچوں کو بلکتے دیکھا۔ اُس نے عصمتوں کو لٹتے دیکھا۔ اُس نے ضمیروں کی موت دیکھی۔ اُس نے ہمالیہ کی چٹانوں سے زیادہ سخت دل دیکھے۔ اُس نے مایوسیوں، آہوں، آنسوؤں۔۔۔۔ کا اُبھار دیکھا۔ اُس نے دیکھا۔۔۔۔۔۔ شیطان اور ابلیس انسان یہاں بھی رقصاں ہے۔ اُس نے یہاں بھی قبائلی دیکھے۔ جو قومی اور ہم وطن بھائیوں کے روپ میں موجود تھے۔ اُس نے اُن قربانیوں کا مشاہدہ کیا۔ جو کشمیر کی بیٹیوں نے دی۔

مردہ اور بے حس ذہنیت والے انسانوں کو دیکھا ——

اُس نے اشرف المخلوقات کو دیکھا۔۔۔ اُس نے تڑپتی سسکتی بلبلاتی زندگی کے آنسو دیکھے۔ آہ! اور۔۔۔۔

اور وہ جذباتی موت مر گیا۔

وہ جلد از جلد کیمپ سے بھاگ جانے کی لٹالی کرنے لگا۔ ایک پنچھی کی مانند فوراً ایک ہی اڑان میں اڑ کر ـــــــ لیکن اپنے پر لوٹتے ہوئے پائے آخر ایک دن وہ وہاں سے دل شکستہ ہو کے چل دیا۔ . . بوڑھی، بھوکی اور کمزور ماں نے اُس سے کہا ـــــــ "شام چلو رویں!" اور وہ چل دیئے رونے!

ـــــــ وہ ایک دوکاندار کے پاس نوکری کرنے لگا۔ لیکن اُس کو ٹھکرایا گیا۔ اُس نے حاکموں اور قوم کے رہنماؤں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ لیکن اس کی آرزوں کا خون ہوا۔ ـــــــ اُس کے بلند ارادے مر کر رہ گئے۔ اُس کا عزم دم توڑ گیا۔

آخر وہ ایک شرنارتھی تھا نا ـــــــ؟

اور پھر ـــــــ وہ بھوکا پھرتا رہا۔ اُس نے مزدوری کی۔ اور جو کچھ وہاں سے مِلتا۔ اُس سے اپنا اور ماں کا پیٹ پالتا۔ لیکن بعض اوقات کام نہ مِلنے پر وہ بھوکا رہ جاتا۔ اُس کے ہونٹوں پر پیپڑے جم چکے تھے۔ اُس کی بوڑھی ماں کو ناکافی خوراک ملنے سے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں ـــ اُس کی ہڈیاں ـــ سوکھی اور مرجھائی ہوئی ہڈیاں باہر جھانک رہی تھیں۔

اور آج ـــ سات دن ہوئے مزدوری نہ ملی۔ شرنارتھیوں کی کثرت کی وجہ سے شہر میں مزدوری عنقا ہو چکی تھی ـــ اور نتیجہ یہ نکلا کہ آج سات دِن سے وہ بھوکا تھا۔ آج سات دن سے اُس کی پیاری بوڑھی ماں بھوکی تھی ـــ ـــ جسکی ہڈیاں باہر آنکلی تھیں۔ . . . . جو بھوک سے نڈھال تھی!

وہی ماں! شیام کی پیاری ماں ـــــــ اوروں کو کھلانے والی ماں۔ آہ! آج خود سات دن سے بھوکی تھی!

اور بھوک سے نڈھال ـــــــ

اس موہوم اُمید پر وہ پولو گراونڈ کی اور جا رہا تھا۔ کہ شاید مزدوری مِل سکے۔

"مزدور!"

اُس نے نگاہیں پھیرلیں۔ تو کچھ دور ایک صاحب ایک ٹرنک اٹھوانا

چاہتے تھے۔ مزدور کی خوشی ایک ناگہانی طاقت بنکر اُس کی ٹانگوں میں سمائی اور وہ دوڑ پڑا۔ ٹرنک بمشکل اٹھایا اور چل دیا ـــــ چل نہ سکا۔ لیکن "کچھ" ملنے کی امید سے وہ چل پڑا ـــــ ایک ارادہ اور عزم لیکر۔

اور ـــــ

پولو گراونڈ کے موڑ پر پہنچ چکا تھا ـــ کہ موٹر کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ بائیں طرف مڑا ـــــ لیکن اُس کا دم پھول گیا۔ وہ فٹ پاتھ پر بھی نہ چڑھ سکا ـــ

موٹر ٹھیک اُس کو روندھتی ہوئی چلی گئی ـــ دوسرے لمحے ـــــ دھرتی نے اُس کے گرم ارادوں اور ولولوں سے پُر خون کو جگہ دی۔ اور اُس دھرتی کے ساتھ لپٹ گئی۔ اُس کی پھڑ پھڑاتی لاش سڑک کے کنارے اُس صاحب، موٹر والے سیٹھ اور ـــ "انسان" پر قہقہے بکھیرتی گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک زہر آلودہ مسکان چمک رہی تھی۔

دُور کوئی اُلو ـــــ "ہو ہو" کی مہیب اور ہولناک آوازیں چلایا۔ آسمان پر دو بادل کے ٹکڑے مل کر ایک عظیم کرخت میں بدل گئے۔ دُور ..... ہوا درختوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ "ماں!" اُس کے مردہ لبوں سے ایک چیخ نکلی۔ "میں جا رہا ہوں"! .... شاید وہ جا رہا تھا ..... لیٹنے!

بتا اے انسان!

وہ ماں آج کس طرح سو سکے گی۔ اُس کی بھوکی اور کانپتی ہوئی نگاہیں آج سڑک پر ہی ٹھوکر کھا رہی ہیں گی۔ اُس کے بھوکے ..... یاس آمیز ..... چہرے پر یاس کی نئی نئی لکیریں پھیلتی جائیں گی ..... اُسے کون سُنا دے ..... کہ تیرا انتظار عبث ہے، اِسے کون بتائے ..... کہ تیرا شیام آج تیرے حکم کی تعمیل میں رونے چلا ہے۔ "اے انسان بتا!"۔

ماہنامہ "اُستاد" سرینگر

دیپ پبلی کیشنز

کی

فخریہ پیشکش

منٹو کتھا

" ڈاکٹر برج پریمی نے اُردو زبان و ادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیے ہیں اُن کی اہمیت مسلّم ہے۔ منٹو پر ان کی کتاب ایک بڑے فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔"

—— پروفیسر آل احمد سُرور
(علی گڑھ)

برج پریمی صاحب کی تصنیف "منٹو کتھا"
کا ایک نُسخہ موصول ہوا - انھوں نے ہر طرح
سے منٹو کا حق ادا کر دیا ہے - پہلے ان کے فن
پر مقالہ لکھا - اب ان کی شخصیت اور حالات
پر مبنی یہ تصنیف - مَیں نے اسے دلچسپی سے پڑھا اور
مجھے اس سے منٹو کے بارے میں "خیر و شر"
دونوں باتوں کا عِلم ہُوا - منٹو کی زندگی اس
کے فن کی طرح ایک کھُلی کتاب تھی -

—— پروفیسر مَسعُود حسُین خان
(علی گڑھ)

○

"منٹو کتھا" مل گئی تھی . . . . .

برج پریمی صاحب کا کام منٹو پر بنیادی نوعیت کا ہے۔ منٹو کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص مرحوم برج پریمی کے کام سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس میں کھپا دی۔ ان کا ادبی کمٹمنٹ مثالی تھا۔ ان کی دل سوزی، نیکی اور شرافت ان کے رفقا کے لیے نمونے کا درجہ رکھتی ہے۔"

پروفیسر گوپی چند نارنگ
(دہلی)

○

"برج پریمی مرحوم بہت سادہ طبیعت، مرنجاں مرنج اور منکسر المزاج انسان تھے۔ جوڑ توڑ، سیاست اور نمائش پسندی سے کوسوں دور، نہایت خاموشی لیکن پورے انہماک اور سنجیدگی سے اپنے کام میں مشغول رہتے تھے ــــــ زیرِ نظر کتاب "منٹو کتھا" منٹو شناسی کے میدان میں اُن کے دوسرے اہم کارنامہ کا درجہ رکھتی ہے ــــــ اس کے پہلے مضمون "منٹو کا خاندان" میں اُن کے آباواجداد کے بارے میں برج پریمی نے وقیع اور نادر معلومات یکجا کردی ہیں۔ اپنے مضمون "منٹو اور کشمیر" میں بھی منٹو کی اضطراب آسا اور ناآسودہ شخصیت کے تعلق ماخذوں کی طرف وقیع اشارے کیے ہیں۔ باری علیگ جو منٹو کے اوّلین سرپرست اور رہنما تھے۔ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے لیکن اُن کے بارے میں اس سے قبل کسی نے لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ڈاکٹر برج پریمی نے ان کی زندگی کے بارے میں بہت قیمتی معلومات جمع کی ہیں اور خود منٹو کی تحریروں سے ان کی سیرت کا نقش اُبھارا ہے اور یہ بجائے خود بڑا دل آویز خاکہ بن گیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر برج پریمی کا نثری اسلوب بھی اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ صاف و شفاف اور روشن نظر آتا ہے۔"

پروفیسر قمر رئیس (دہلی)

دیپ پبلی کیشنز
کی
چند مطبوعات

حرفِ جستجو	(تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر برج پریمی	۲۵/-
جلوۂ صد رنگ	(" ")	"	۷۵/-
ذوقِ نظر	(" ")	"	۴۰/-
سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے		"	۶۵/-
چند تحریریں	(تحقیق و تنقید)	"	۵۵/-
کشمیر کے مضامین	(")	"	۶۰/-
جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما	(تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر برج پریمی	۱۰۰/-
منٹو کتھا	(" ")	"	۲۰۰/-
سپنوں کی شام	(افسانے)	"	۱۰۰/-
پریم ناتھ پردیسی			
عہد، شخص اور فنکار	(تحقیق و تنقید)	"	(زیرِ طبع)
برہم چند: چند نئے مباحث		"	(")
جدید اردو شاعری	(تحقیق و تنقید)	پریمی رومانی	۲۵/-
اوراق	(" ")	"	۶۰/-
انتخابِ مضامین	(" ")	"	۱۰۰/-
تحریر و تقریر	(" ")	"	۱۰۰/-
ردِ عمل	(" ")	"	۱۵۰/-

تقسیم کار: **دیپ پبلی کیشنز**

"تپسیا"، ۳/۱ نصیب نگر، پمپوش کالونی، جانی پورہ، جموں۔
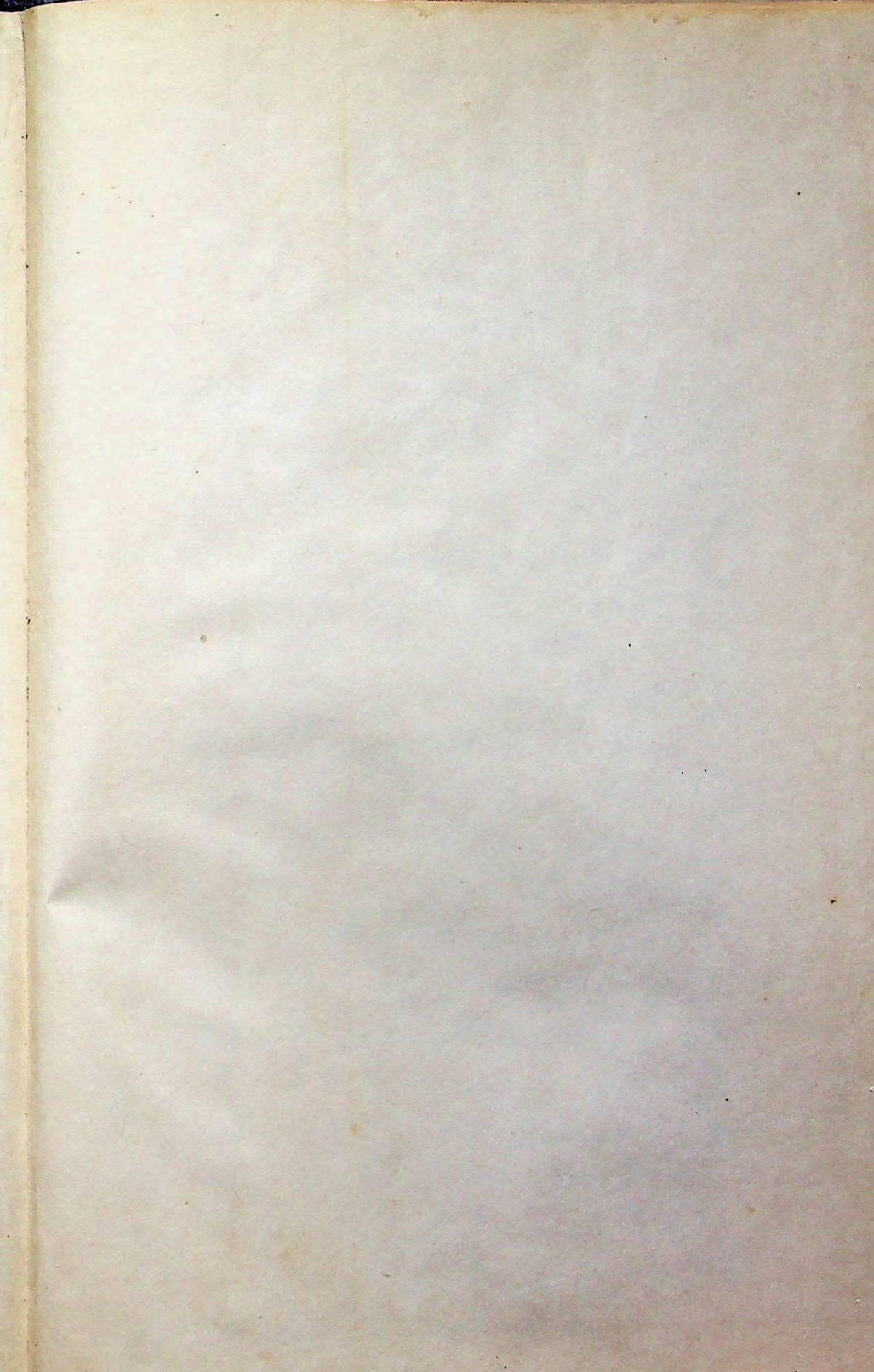
کشمیر کے زندہ کلچر، اس کے فن اور ادب کی صباحتوں کی تصویر
ڈاکٹر برج پریمی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا
ایک اور مجموعہ

"جلوۂ صد رنگ"

- اردو دنیا کے ایک محنتی، باذوق اور صاحب نظر نقاد نے کشمیریات کے وقیع موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور پوری محققانہ ذمہ داری اور ژرف نگاہی سے کام لے کر کشمیر کے تشخص کو نمایاں کرنے کا مستحسن اقدام کیا ہے۔

  —— پروفیسر حامدی کاشمیری، سرینگر

- پریمی کا بے تعصب اور وسیع نقطۂ نظر اس کتاب کے ہر ورق پر آشکار ہے۔ کشمیر کی تواریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔

  —— محمد یوسف ٹینگ، سرینگر

- ڈاکٹر برج پریمی نے قلم کے کئی میدانوں میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار، غیر جانبدار محقق، متوازن شخصیت نگار اور سچے محب وطن ہیں۔ ان کی تصنیف "جلوۂ صد رنگ" کشمیر کے کئی گمنام اور تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔... یہ تصنیف ان کے گہرے تاریخی شعور اور ان کے ذمہ دارانہ تحقیقی رویئے کی آئینہ دار ہے۔....

  —— پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی۔ مظفر آباد۔

- جلوۂ صد رنگ کشمیر کے آرٹ، فن، کلچر اور ثقافت کے تناظر میں اسم با مسمیٰ ہے۔ آپ نے اس میں کشمیر کی تہذیب ماضی اور حال کو بڑی شگفتہ زبان میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسا ادبی جام جہاں نما ہے جس میں کشمیر کے جلوے بے نقاب نظر آتے ہیں۔

  —— پروفیسر عنوان چشتی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

تقسیم کار:-
دیپ پبلی کیشنز
تیسیا-۵۸، آزاد بستی، نٹی پورہ سرینگر۔ کشمیر